حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے مشائخ عظام،
خلفاءِ کرام اور سلسلہ کے چند دیگر بزرگوں کا دل آویز اور ایمان افروز تذکرہ

حضرت چاند شاہ صاحبؒ

اور اُن کا خانوادۂ تصوّف

مؤلف
مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

مرتّب
مولانا ضیاء الحق خیر آبادی

تفصیلات

نام کتاب.......... حضرت چاند شاہ صاحبؒ اور ان کا خانوادۂ تصوف

مصنف.......... مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

مرتب.......... مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

باہتمام .... مولانا محمد اویس صاحب

صفحات.......... 180

قیمت ..../=70

تعداد.......... ایک ہزار

سنہ طباعت.......... جولائی ۲۰۰۹ء

ملنے کے پتے

(۱) ضیاء الکتب، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، ضلع اعظم گڈھ (یوپی)
پن کوڈ 276121 (موبائل: 9235327576)

(۲) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

عرضِ مرتب	مولانا ضیاء الحق خیر آبادی	۹
مُقدّمۃ	حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی	۱۱

☆☆☆☆☆☆☆

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	**حضرت چاند شاہ صاحبؒ**	۲۰
۲	**حضرت شاہ ابوالحسن نصیر آبادیؒ**	۴۱
۳	**حضرت شاہ مراد اللہ تھانیسریؒ**	۴۱
۴	**حضرت شاہ نعیم اللہ بھرائچیؒ**	۴۲
۵	**حضرت شاہ محمد نعمت اللہ صاحبؒ**	۴۴
☆	اوصاف و اخلاق	۵۰
☆	تصانیف	۵۶
☆	ملفوظات	۵۶
☆	وفات	۶۳
☆	شاعری و تصنیفات	۶۴
۶	**حضرت مولانا عبد الغفار صاحبؒ** محدث مئو	۶۶
☆	بیعت	۷۰
۷	**حضرت سلطان شاہ صاحب** جون پوریؒ	۷۱

☆	ولادت	۷۴
☆	ایک بیوہ کی خدمت	۷۹
☆	کرامات	۸۰
☆	فہم صحیح	۸۱
☆	اولاد	۸۳
☆	وفات	۸۳
۸	**حضرت مولانا سیّد عبداللہ صاحبؒ** اہرولی	۸۵
☆	مجاہدہ وریاضت	۸۶
☆	حضرت شاہ صاحب کی توجہ	۸۸
☆	اللہ کی مدد	۹۰
☆	مزید عطیہ	۹۰
☆	کوٹی میں آنے والے لوگ	۹۱
☆	تعمیر مسجد	۹۲
☆	حضرت مولانا کا حجرہ	۹۴
☆	حضرت شاہ صاحب کی ایک کرامت	۹۴
☆	خانقاہ میں مدرسہ	۹۵
☆	مرشد کی خدمت اور دوسرے احوال	۹۵
☆	خانقاہ اہرولی میں ایک پہلوان	۹۶
☆	ایک عجیب واقعہ	۹۸
☆	قادیانیوں کی شورش	۹۹

☆	شدھی تحریک	۱۰۰
☆	اللہ کی نشانیاں	۱۰۳
☆	خانقاہ پر حملہ کی تیاریاں	۱۰۳
☆	حج کا ارادہ	۱۰۴
☆	حضرت شاہ صاحب کی وفات	۱۰۴
☆	سفر حج	۱۰۶
☆	وفات	۱۰۷
۹	**حضرت مولانا ریاض احمد صاحبؒ** چمپارنی	۱۰۹
☆	ولادت	۱۱۰
☆	طالب علمی	۱۱۱
☆	شوق مطالعہ	۱۱۱
☆	مدرسی	۱۱۲
☆	دار العلوم دیوبند میں	۱۱۲
☆	سیاسی نظریات	۱۱۳
☆	سلوک روحانی	۱۱۴
☆	مولانا بشارت کریم صاحب کی خدمت میں	۱۱۷
☆	اوصاف وکمالات	۱۱۸
☆	ایک عجیب مخلصانہ جذبہ اور عمل	۱۱۹
☆	ذوق عبادت اور استقامت	۱۲۱
☆	تواضع وتاثیر	۱۲۲

☆	سالک کا حال	۱۲۲
☆	فنا در کار ہے	۱۲۳
۱۰	**مکاتیبِ ریاضیہ**	۱۲۴
☆	جمعیت باطن	۱۲۵
☆	سلوک کا راستہ	۱۲۶
☆	حوصلہ اور اعتماد علی اللہ	۱۲۷
☆	تصوف کا حاصل	۱۲۷
☆	پہلے خودی کو آگ لگاؤ	۱۲۸
☆	جوانی کے خطرات	۱۲۹
☆	صحبت ناجنس	۱۳۰
☆	سالک کی اور شرطِ کامیابی	۱۳۱
☆	قلبِ انسانی مظہر تجلیات	۱۳۳
☆	طالب اور مرید کو کیسا ہونا چاہیئے؟	۱۳۳
☆	درویش کے دو قدم	۱۳۴
☆	ہادیٔ حقیقی اور اصلی پیر	۱۳۴
☆	رسائی کا سامان	۱۳۵
☆	تصوف کی روح	۱۳۶
☆	قربِ الٰہی کیونکر حاصل ہوتا ہے؟	۱۳۶
☆	ذکر کثیر	۱۳۷
☆	نظر کی بلندی اور ثبات واستقامت	۱۳۷

☆	معرفت الٰہی اور قلبی ذوق وشوق	۱۳۸
☆	طریقت کا راستہ	۱۳۹
☆	تصوف ایک جذبۂ بے قرار ہے	۱۳۹
☆	منافع وثمرات کی کمی کی وجہ	۱۴۰
☆	تصورِ شیخ اور رابطہ	۱۴۰
☆	جو کچھ تصور میں آیا وہ خدا نہیں ہے	۱۴۱
☆	ایک طالب کو نصیحت	۱۴۱
☆	عاجزی ونیستی	۱۴۲
☆	دل کا اطمینان اللہ کی یاد میں ہے	۱۴۳
☆	اصل کار محبتِ الٰہی ہے	۱۴۳
☆	ایک طالب علم کو نصیحت	۱۴۴
۱۱	**حضرت مولانا شاہ محمد ہارون صاحبؒ**	۱۴۶
☆	بچپن کا کھیل	۱۴۹
☆	تعلیم	۱۵۰
☆	مولانا محمد ہارون صاحب کی شاعری	۱۵۱
☆	حضرت شاہ صاحب کا مرثیہ	۱۵۲
☆	والد گرامی کی وفات	۱۵۴
☆	ترک وطن	۱۵۵
۱۲	**حضرت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ**	۱۵۸
☆	ولادت اور تعلیم	۱۵۹

☆	تدریس	۱۶۰
☆	مدرسہ حمیدیہ گودنا میں	۱۶۲
☆	اندازِ تدریس	۱۶۳
☆	بیعت وسلوک	۱۶۴
☆	حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کی خدمت میں	۱۶۵
☆	حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کی خدمت میں	۱۶۸
☆	حضرت امیر شریعت کے معمولات وخصوصیات	۱۶۸
☆	طلبہ پر شفقت	۱۷۰
☆	صلۂ رحمی	۱۷۰
☆	اپنے اہل کے ساتھ حسن سلوک	۱۷۲
☆	مہمان نوازی	۱۷۳
☆	اَن دیکھے مہمان	۱۷۴
☆	تقویٰ	۱۷۴
☆	ورزش اور پیدل چلنا	۱۷۶
☆	امتیازی خصوصیات	۱۷۶
☆	نائب امیر شریعت	۱۷۷
☆	امیر شریعت خامس	۱۷۷
☆	علالت اور وفات	۱۷۸
☆	قبر شریف	۱۷۹

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

ڈھائی سال پہلے استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ کے قلم سے مختلف شخصیات پر لکھے ہوئے تاثراتی مضامین کا مجموعہ ”کھوئے ہوؤں کی جستجو“ جو ۶۱/ شخصیات کے تذکرہ پر مشتمل ہے، احقر کی ترتیب وتحقیق کے ساتھ شائع ہوا، اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور شوق کے ہاتھوں سے لیا گیا، اب اس کا پہلا ایڈیشن ختم کے قریب ہے۔

اس کے مقدمہ میں مَیں نے لکھا تھا کہ:

> ”مؤلف نے اور بھی بہت سے کھوئے ہوؤں کا سراغ لگایا ہے، جن کو انشاء اللہ آئندہ پیش کیا جائے گا۔ خصوصاً حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی علیہ الرحمہ اور ان کے سلسلے کے بہت سے مشائخ کا تذکرہ حضرت مؤلف دامت برکاتہم کے قلم سے رسالہ ضیاء الاسلام میں آچکا ہے، ارادہ ہے کہ اسے بھی جلد ہی کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔“

اب یہ ارادہ شرمندۂ عمل ہو رہا ہے، اور حضرت چاند شاہ صاحب اور ان کے سلسلہ کے عالی مرتبت مشائخ کا ذکر خیر منظر عام پر آرہا ہے، باری تعالیٰ سابقہ مجموعہ کی طرح اسے بھی حسن قبول سے نوازے اور ان انفاس قدسیہ کے نقش قدم پر ہمیں بھی چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جی چاہتا کہ ہے اس مختصر سی تمہید کا خاتمہ حضرت مؤلف کی اس تحریر پر کروں جس میں انھوں نے اس طرح کے تذکروں کے لکھنے کی وجہ بیان کی ہے:

> ”بعد والوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ اگلوں کے محاسن اعمال، مکارم اخلاق اور معالی احوال کو یاد رکھیں، ان کا مذاکرہ کریں، انھیں بعد والی نسل تک منتقل کریں، تاکہ بعد والوں کو یاد رہے کہ ان کے اسلاف کیسے تھے؟ ان میں اتباع سنت کی کیا شان تھی؟ ان

کے احوالِ باطنی کیا کیا تھے؟ پھر ان کے دل میں حوصلہ اور ولولہ جاگے، کہ ہمارے بزرگ بھی خاک کے پتلے ہی تھے، گوشت و پوست کے ڈھانچے ہی تھے، انھیں امراض وعوارض میں وہ بھی گھرے رہتے تھے جن میں آج کا انسان مبتلا ہے، مگر اس کے باوجود وہ بندگی کا حق کس طرح ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اللہ کو راضی کرنے کے کیا کیا جتن کئے، انھوں نے دنیوی مال و دولت کو کس طرح اپنی ٹھوکر میں رکھا۔ کیا یہ سب کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص تھا، ان کے بعد جو خاک کے پتلے تیار ہوئے، اور ہڈیوں کے جو ڈھانچے گوشت و پوست کا لباس پہن کر وجود میں آئے، کیا وہ اس صلاحیت سے محروم ہیں؟ جب انھیں یہ خیال آئے گا تو ان کے اندر کی سوئی ہوئی عبدیت جاگے گی، چھپا ہوا جذبۂ کمال ابھرے گا، خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ سکتا ہے، ایک چراغ سے دوسرا چراغ جل سکتا ہے، ایک طوطی کی آواز سن کر دوسرا طوطی ترنم ریز ہو سکتا ہے۔ تو کیا معنیٰ کہ ایک انسان، دوسرے انسان کو دیکھ کر اسی راہ پر نہ چل پڑے۔

سیرت نویسی اور سوانح نگاری کی اصل منشاء یہی ہونی چاہئے، اور پڑھنے والوں کو بھی اسی نظر سے پڑھنا چاہئے، واقعات وحکایات کا بیان، شہور وسنین کا اہتمام، تاریخ ویوم کی تقدیم وتاخیر پر گہری نظر، مؤرخ کا فریضہ ہو تو ہو، سوانح نگار کو اس کا مکلّف نہیں بنایا جاسکتا، اس سلسلے میں اس کے تسامحات قابل عفو ہیں۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے، اسے مؤرخ کی نگاہ سے مت پڑھئے، بلکہ تذکیر واعتبار کی نگاہ سے پڑھئے۔ انشاء اللہ آپ فائدے میں رہیں گے۔" (تذکرۂ مولانا عبد القیوم صاحب فتح پوریؒ، ص: ۸/۷)

ضیاء الحق خیرآبادی
ایڈیٹر ماہنامہ ضیاء الاسلام
واستاذ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ
یکم رجمادی الاخریٰ ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۷ رمئی ۲۰۰۹ء چہارشنبہ

* * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقَدِّمَۃ

سعی وجستجو کی داستانِ سفر

عند ذکر الصالحین تتنزل الرحمۃ، مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے، اور بالکل حق ہے، اللہ کے برگزیدہ بندوں پر ہر وقت رحمت الٰہی کے جھونکے چلا کرتے ہیں، ، جب ان کا تذکرہ ہوتا ہے، تو رحمت کے جھونکے تذکرہ کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

یہ خاکسار، گناہگار بندہ جو باوجود سیاہ کاری کے، رحمت الٰہی کا حریص ہے اور اسی واسطے سے رحمت الٰہی کے سائے میں حاضری چاہتا ہے، عرض کرتا ہے کہ یہ کچھ ایسے برگزیدہ بندوں، اللہ والوں، صاحب نسبت بزرگوں اور عابد وزاہد مردوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے اپنے حالات وکمالات پر گمنامی اور بے نشانی کا دبیز پردہ ڈالے رکھنا ہی اپنی زندگی میں پسند کیا تھا، پس وفات کے بعد بھی وہ اسی گمنامی کی چادر میں لپٹے رہے، مگر جب اللہ کو منظور ہوتا ہے کہ ان پر سے گمنامی کی چادر اترے، تو اس کے اسباب پیدا کر دیتے ہیں، اور کچھ لوگ کھود کرید کر ان کے حالات نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اس سے ان کے کمالات میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا، البتہ کریدنے والا اگر مخلص ہو تو اس کی اصلاح وتربیت کا سامان ہو جاتا ہے، اور پڑھنے والوں میں بہتوں کے لئے راہِ ہدایت آسان ہو جاتی ہے، اسی طرح کے اسباب کی ایک داستان سنئے!

نومبر ۱۹۹۸ء کی آخری تاریخیں تھیں ، یہ نامہ سیاہ اپنے کچھ خصوصی دوستوں کے حلقے میں بھوارہ ضلع مدھوبنی بہار، میں حاضر تھا، بہار واُڑیسہ کے امیر شریعت خامس حضرت مولانا شاہ عبدالرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ کا وصال قریبی مدت میں ۲۹ رستمبر ۱۹۹۸ء کو ہوا تھا، میرے بزرگ دوست اور حضرت امیر شریعت کے خواہرزادہ اور داماد مولانا وصی احمد صاحب شمسی مدظلہ بھی تشریف فرما تھے، انھوں نے گفتگو کے دوران تحریک کی کہ حضرت امیر شریعت خامس علیہ الرحمہ کی بزرگ اور صاحب نسبت شخصیت پر آپ کا ایک مضمون آنا چاہئے ، میں نے اس فرمائش کی تعمیل کو اپنے حق میں سرمایۂ سعادت سمجھا۔ اہل اللہ اور خاصان خدا کی جو محبت وعقیدت اوران سے جو ربط وتعلق میں اپنے دل میں پاتا ہوں، اس کی بنیاد پر مجھے خوشی ہوئی کہ مولانا نے اس حقیر وفرومایہ کو کسی درجہ میں قابل اعتناء سمجھا، کہ ایک بزرگ صاحب نسبت شخصیت پر یہ بندہ تحریر کی سعادت حاصل کرے۔

حضرت امیر شریعت خامس کا تعلق جن بزرگوں سے تھا، ان کا سلسلہ درمیان کے چند مشائخ سے ہوتا ہوا ہمارے قریبی علاقہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد (موجودہ امبیڈکرنگر) کی بہت بابرکت اور بافیض شخصیت حضرت چاند شاہ صاحبؒ تک پہونچتا ہے، اور پھر وہاں سے دہلی کے مشہور بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے ہوتا ہوا امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ تک منتہی ہوتا ہے۔

مولانا وصی احمد صاحب نے جب حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا تذکرہ چھیڑا تو میری نگاہ میں حضرت چاند شاہ صاحبؒ تک یہ سلسلہ جلوہ گر ہوگیا، اسی وقت دل میں خیال پیدا ہوا کہ حضرت چاند شاہ صاحب سے شروع کر کے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب تک اس سلسلے کے بزرگوں کے حالات جمع کردوں، لیکن ان کے حالات کی تلاش مشکل تھی، ان بزرگوں سے کام تو بہت ہوا، مگر کام کرتے ہوئے یہ حضرات اپنے نام کو اس طرح چھپالے گئے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی صرف نام ہی کی حد تک واقف ہیں، اور بعض حضرات تو اپنا نام

بھی اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

میں نے تلاش کیا تو حضرت چاند شاہ علیہ الرحمہ کے حالات کسی قدر مختلف واسطوں سے ملے، اس کے لئے میں نے ٹانڈہ حضرت کے گھرانے میں بھی حاضری دی، وہاں حضرت کے حفید رشید حضرت میاں ظہور الحسن صاحب علیہ الرحمہ سے ملاقات ہوئی، ان سے کچھ دریافت کرنا چاہا تو انھوں نے حضرت چاند شاہ کے سلسلے میں کچھ بتانے کے بجائے معرفت الٰہی، توحید ربانی اور نفس انسانی کی بے بضاعتی و بے چارگی پر ایک مفصل موثر تقریر فرمادی، جس سے ایمان تازہ ہوگیا، روح شاداب ہوگئی، مگر چاند شاہ صاحب کے متعلق کچھ نہیں بتایا، میں نے درخواست کی کہ قبر شریف دکھادیں، تو مسجد کے سامنے جو خالی زمین ہے، جو ہے تو قبرستان مگر قبر کی علامتوں سے بے نیاز ہے، اسی میں ایک درخت کے پاس لے گئے کہ یہیں قبر ہے، اللہ اکبر! اللہ کا نام بلند کرنے والے نے اپنا نام تو مٹایا ہی تھا، قبر کا نشان تک باقی نہ رہا۔

چاند شاہ صاحب کے خلیفہ ارشد حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے متعلق میں نے مولانا وصی احمد صاحب سے دریافت کیا، تو انھوں نے مدرسہ حمیدیہ گودنا ضلع چھپرا، بہار کی رہنمائی کی، میں وہاں حاضر ہوا، اس مدرسہ کے ذمہ دار مولانا محمد مصطفیٰ صاحب سے جو حضرت امیر شریعت خامس کے خصوصی تلامذہ میں ہیں، ملاقات ہوئی، انھوں نے مہمان نوازی کا حق ادا کردیا۔ ان سے جب میں نے حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے ایک مختصر رسالہ ”تاریخ ولی کامل“ کے نام سے دیا، اس رسالہ میں حضرت شاہ صاحب کے حالات اختصار سے لکھے گئے ہیں، شاہ صاحب کے ایک خلیفہ مولانا محمد جمیل صاحب فخر المحدثین مدرسہ عالیہ کلکتہ نے اسے مرتب کیا ہے، اس میں حالات بھی ہیں، ملفوظات بھی ہیں، سلسلے کے شجرات بھی ہیں۔ اسی جلد میں حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کے تصنیف کردہ رسائل بھی ہیں، جنھیں مولانا محمد جمیل صاحب نے ”کلیات نعمت“ کے نام

سے یکجا کردیا ہے۔

اس کتاب سے بہت مدد ملی، اور حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب پر ایک قدرے مفصل مضمون تیار ہوگیا۔ اس کتاب سے حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب قدس سرہٗ کے چند خلفاء کا سراغ ملا، جن کا ذکر آگے چل کر کروں گا۔

حضرت سلطان شاہ صاحب کے حالات کی جستجو ہوئی، تو ان کے پڑپوتے مولانا محمد اکرم صاحب جون پوری نے اپنے والد گرامی مولانا محمد عثمان صاحب جون پوری کا ایک مضمون جو کبھی ماہنامہ نظام کان پور میں چھپا تھا، تلاش کرکے دیا، اسی کو بنیاد بنا کر سلطان شاہ صاحب پر ایک مضمون مرتب کیا۔

''تاریخ ولی کامل'' سے حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کے جن خلفاء کا سراغ ملا، ان میں دو بزرگ بہت اہم ہیں، ایک وہ جنھیں مرتب کتاب ''خلیفہ اعظم'' کہتے ہیں، یہ اہرولی ضلع کشی نگر کے مولانا سیّد عبداللہ صاحب علیہ الرحمہ ہیں، اور دوسرے زبردست صاحب علم وفضل اور صاحب نسبت حضرت مولانا ریاض احمد صاحب چمپارنی علیہ الرحمہ ہیں۔

حضرت مولانا ریاض احمد صاحب علیہ الرحمہ کے حالات کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی، مولانا کے مکتوبات جو کہ ''مکاتیب ریاضیہ'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں، وہ مجھے اپنے بعض طالب علموں کے ذریعے دستیاب ہوگئے، کتاب کے آغاز میں ان کا مفصل تعارف مختلف اصحاب کے قلم سے موجود ہے، وہ میرے لئے ماخذ بنے۔ لیکن حضرت مولانا سیّد عبداللہ صاحب سے بالکل ناواقف رہا، انھیں کہاں ڈھونڈھوں،، ان کے حالات کا پتہ کیسے لگاؤں؟ وہ شاہ نعمت اللہ صاحب کے خلیفہ اعظم تھے، شاہ صاحب خود ان کی عظمت کے معترف تھے، ان کے لئے اور ان کے مرشد شاہ صاحب کے لئے حضرت چاند شاہ صاحب نے صدیق ہونے کی دعا کی تھی، نیز ان کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اکابر علماء وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے، مثلاً مشہور محدث حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مئوی

علیہ الرحمہ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالحسن صاحب وغیرہ، لیکن باوجود تلاش کے کچھ سراغ نہ ملتا تھا، بلکہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اہرولی کہاں ہے۔

ایک روز اپنے ایک بزرگ دوست مولانا نوراللہ صاحب چمپارنی کے سامنے تذکرہ کیا تو وہ واقف نکلے، انھوں نے بتایا کہ یہ جگہ ضلع پڈرونہ میں ہے، جواب کشی نگر ہو گیا ہے، ان سے کچھ اور اتہ پتہ معلوم ہوا تو میں نے اسی ضلع کے اپنے ایک طالب علم عزیز حافظ وصی اللہ سلّمہٗ کو ادھورا پتہ بتا کر اہرولی بھیجا، وہ طالب علم پتہ لگاتے لگاتے خانقاہ اہرولی میں پہونچ گیا، وہاں اس کی ملاقات حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے ایک پوتے سید سراج احمد صاحب سے ہوئی، یہ صاحب اس علاقے کے ایک بااثر نیتا ہیں، کبھی ممبر پارلیمنٹ رہ چکے ہیں، انھوں نے عزیز موصوف کی بہت خاطر کی، اور حضرت مولانا کے حالات لکھ کر دئے، بہت مختصر حالات تھے، مگر پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ سید صاحب موصوف تحریر کی خوب قدرت رکھتے ہیں، میرا جی چاہا کہ اس خانقاہ میں خود حاضری دوں۔

میرے لئے طویل سفر کے دو موقعے سال میں ہوتے ہیں، ایک تو شوال میں، دوسرے رجب میں جب کہ امتحان سالانہ کی تیاری کے لئے اسباق بند ہوتے ہیں، یہ موقع ۱۵؍رجب سے ۳۰؍رجب تک ہوتا ہے، رجب ۱۴۱۹ھ کی ۱۵؍کو نوتنواں ضلع مہراج گنج سے سفر شروع ہو کر دربھنگہ پر تمام ہونا تھا، یہ دس بارہ روز کا سفر تھا، اس میں ایک روز اہرولی کے لئے مختص کیا گیا، مولانا نوراللہ صاحب بھی ہمراہ تھے، سید سراج احمد صاحب کو اطلاع کر دی گئی تھی، تمکوہی روڈ اسٹیشن کے قریب، اس سے مغرب میں وہ خانقاہ ہے، ظہر کے وقت ہم لوگ پہونچے، سید صاحب موصوف منتظر تھے، وہ کل لکھنؤ تھے، آج کسی طرح عجلت میں وہ پہونچے تھے، بہت مدارات کی، حضرت چاند شاہ کے سلسلے کی تمام شاخوں میں تواضع اور ضیافت کی ایک خاص شان ہے، جو بکثرت مشاہدہ میں آئی ہے، تواضع اور مسکنت میں یہ سلسلہ بے نظیر ہے، ان سے ملاقات ہوتے ہی اندازہ ہو گیا کہ چاند شاہی نسبت کا پرتو پڑا

ہے، وہی انکساری، وہی خوش اخلاقی، وہی نرم کلامی، وہی بچھے جانے کا انداز وہی خدمت کرنے کا جذبہ جس کا بار بار تجربہ ہو چکا ہے۔

خانقاہ اب غیر آباد ہے، حضرت مولانا ہی کے پوتے پر پوتے موجود ہیں، ان میں بھی اکثر تعلیم یا ملازمت یا تجارت کے سلسلے میں باہر مقیم ہیں، خانقاہ بالکل سنسان ہے، باغ جنگل بن چکا ہے۔ ہر طرف سناٹے کا راج ہے، لیکن اس کے باوجود وہاں اتنی دل بستگی محسوس ہوئی جیسے وہ ساری رونقیں ابھی تک موجود ہیں، جو کبھی رہی ہوں گی، اس ویرانہ میں طبیعت گھبرانا تو کجا، جی چاہتا تھا کہ یہیں رہ جائیے، دن اور رات کسی وقت کوئی وحشت نہیں محسوس ہوئی، خانقاہ کے مغرب میں حضرت مولانا کی قبر شریف ہے، جہاں سکینت ہی سکینت برس رہی ہے۔ وہاں وہ کمرہ بھی دیکھا جس میں حضرت مولانا کی رہائش تھی، اور وہی مولانا کی عبادت گاہ بھی تھا، اب اس میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں، یہ کتابیں حضرت مولانا کے ہاتھ کی ہیں، اب بوسیدہ ہو چکی ہیں، بہت سی کتابیں ضائع ہو چکی ہیں، پھر بھی اچھی خاصی موجود ہیں، مولانا کے پوتے سید سراج احمد صاحب ان کی تجلید کروا رہے تھے، ان کتابوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا علمی ذوق بہت بلند تھا، وقت کے اکابر علماء بالخصوص محدث وقت حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مئوی قدس سرہ سے بہت گہرے تعلقات تھے۔

اس کتب خانہ سے، حضرت مولانا ابوالحسن صاحب مئوی علیہ الرحمہ کا رسالہ ”ضیاء الایمان‘ ملا، جس میں حضرت چاندشاہ صاحب علیہ الرحمہ کے مزید کچھ حالات ملے۔

رات میں خانقاہ اہرولی میں قیام رہا، یہ رات بڑی بابرکت تھی، طبیعت پر نہایت انبساط اور بشاشت کا غلبہ رہا، زیادہ تر حصہ جاگ کر گزرا، جنگل تھا مگر نور کا سماں تھا۔ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی نسبت باطنی کا شاید اثر تھا کہ قلب وجگر محبت الٰہی میں سرشار رہا۔

صبح ہمیں ندی پار کر کے بہار میں داخل ہونا تھا، سیّد سراج احمد صاحب نے ازراہ

شفقت رفاقت کا عزم کیا، ندی پار کرکے ضلع چمپارن شروع ہوتا ہے، ندی سے دس بارہ کیلو میٹر کے فاصلے پر بگہا نامی بستی ہے، جس میں حضرت مولانا عبداللہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ گرامی قدر مولانا محمد ہارون صاحب نے اقامت اختیار کی تھی، ان کی خانقاہ بگہا کے قریب ایک جنگل میں ہے، اور اب ان کے صاحبزدۂ مکرم مولانا بشیر احمد صاحب مدظلہ اس خانقاہ میں تشریف رکھتے ہیں، یہ علاقہ خیر آباد کہلاتا ہے، مولانا نور اللہ صاحب مدظلۂ بگہا کے رہنے والے ہیں، ان کی معیت میں خانقاہ خیر آباد میں حاضری دینی تھی۔

مغرب سے قبل اس خانقاہ میں حاضری ہوئی، یہ خانقاہ، خانقاہ اہرولی کا نقش ثانی ہے، وہی یکسوئی، وہی طمانینت، مولانا بشیر احمد صاحب مدظلہ کا وہی اندازِ تواضع، بچھے جانے کی ادا، اکرام ضیف کا مسنون طریقہ، بہت چھوٹے کو بہت بڑا بنانے کا مخلصانہ انداز!

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں
بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی

مولانا بشیر احمد صاحب نے ایک کاپی عنایت فرمائی، حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب علیہ الرحمہ کے خصوصی خادم بلکہ ان کی خانقاہ کے مدار المہام جنھیں شاہ نعمت اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے ان کی خدمت اور خانقاہ کے انتظامات کے لئے متعین فرمایا تھا، وہ کریم خاں کے نام سے معروف تھے، ان کے صاحبزادے جناب محمد مختار صاحب نے یہ کاپی حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب علیہ الرحمہ کے حالات میں مرتب کی ہے، اس میں حضرت مولانا محمد ہارون صاحب کا بھی تذکرہ ہے، مختار صاحب مولانا محمد ہارون صاحب سے دس سال چھوٹے تھے، اور بچپن سے انھیں کی نگرانی اور تربیت میں رہے، بچپن ہی میں ان سے بیعت بھی ہوئے تھے، یہ تحریر خاصی مفصل ہے، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب کی خصوصی عنایت ہوئی کہ انھوں نے یہ کاپی مجھے عنایت فرمائی، حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا محمد ہارون صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اسی سے لکھا ہے، اللہ تعالیٰ مختار صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے، انھوں نے بڑا کام کیا۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ کے متعلق معلومات مولانا وصی احمد صاحب شمسی نے عنایت فرمائے، ان کا شکر گزار ہوں کہ اس تحریر کے وہی محرک بھی ہیں، اور وہی معاون بھی ہوئے، اور اب وہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے سوانح و حالات مرتب کر رہے ہیں، حق تعالیٰ ان کے علم اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔

یہ اس سعی و جستجو کی داستانِ سفر ہے، جو اس خاکسار، کم سواد نے باوجود اپنی کاہلی و بے لیاقتی کے حضرت چاند شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے خانوادے کے لئے گرتے پڑتے کیا ہے، آگے کتاب میں اس کا حاصل آپ پڑھیں گے، یہ تمام مضامین ماہنامہ الاسلام وضیاء الاسلام میں میں شائع ہو چکے ہیں۔

عزیزم مولانا حافظ ضیاء الحق صاحب خیرآبادی سلّمہٗ نے ارادہ کیا کہ ان مضامین کو یکجا کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے، انھوں نے تمام مضامین یکجا کر کے عرصہ ہوا میرے حوالہ کر دیا تھا کہ ان پر نظر ثانی اور اضافہ و ترمیم جس کی ضرورت ہو کر دوں، مگر میری کاہلی نے اسے ٹالے رکھا، اب ان کی عزیمت نے مجھے مجبور کیا، نظر ثانی کی، قدرے اضافے کئے، کہیں کہیں حذف و اختصار کا عمل کیا۔ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب محدث مئو کا تذکرہ بڑھایا، کچھ اور بزرگوں کے تذکرے بھی لکھنا چاہ رہا تھا، مگر کافی معلومات میسر نہ آسکے، امید کرتا ہوں کہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد شاید کچھ اور چیزیں ظاہر ہوں۔

حضرت چاند شاہ صاحب کے اٹھارہ خلفاء تھے، جن میں سے میں نے اس کتاب میں صرف تین کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے علاوہ تین بزرگ کے نام اور معلوم ہیں، جن کے حالات لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) حضرت سلطان احمد شاہ صاحب جون پوری
(۲) حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب سیوانی
(۳) حضرت مولانا عبدالغفار صاحب محدث مئو

اور تین جن کے نام معلوم ہیں، وہ یہ ہیں:

(۴) حضرت شاہ قدرت اللہ صاحب فیض آبادی
(۵) حضرت شاہ عبداللہ صاحب صبرحدی
(۶) حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب فیض آبادی

باقی بارہ حضرات بالکل مخفی ہیں، شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سبیل نکلے۔

اپنے بزرگوں کی خدمت کی یہ پونجی لے کر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوں ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

الٰہی ان بزرگوں کی نسبت روحانی کی برکتیں عطا فرمایئے، اور تادم آخر خدمت ومحبت دین واہل دین میں لگائے لپٹائے رکھئے، اور سانس جب بدن سے جدا ہو، تو کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتی ہوئی باہر نکلے۔ **آمین یارب العالمین**

یہ کتاب کچھ عرصہ پہلے مرتب ہو چکی تھی، مگر طباعت کا انتظام نہ ہو سکا تھا، مولانا انتخاب عالم صاحب قاسمی ناظم مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور نے حضرت چاند شاہ صاحب کے خلیفہ اقدس شاہ سلطان احمد صاحبؒ کے حفید رشید حضرت مولانا جمیل احمد صاحبؒ کے پوتے مولانا محمد اویس صاحب سے اس کا تذکرہ کیا، تو انھوں نے بہت خوشی سے اس کے تعاون کا وعدہ فرمایا۔ اب ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد امجد صاحب مظاہری اور دوسرے بھائیوں کی توجہ اور تعاون سے یہ کتاب منظر عام پر آ رہی ہے، اس کتاب کی طباعت میں بھی ماشاء اللہ حضرت میاں صاحب کی روحانیت کا فیض جلوہ گر ہے، اللہ تعالیٰ ان تمام معاونین کو حسن جزاء سے نوازیں، اور میاں صاحب کے فیوض وبرکات سے مالا مال فرمائیں۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی

۲۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۰؍ مئی ۲۰۰۹ء چہار شنبہ

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت چاند شاہ صاحب قدس سرہٗ ٹانڈوی

(المتوفی ١٣١٧ھ)

مرد کامل وہ ہے جو سینکڑوں کی غلامی سے چھوٹ چکا ہو اور اس نے ایک در کی غلامی کا پٹہ اپنی گردن میں ڈال رکھا ہو، کتنے لوگ ہیں جو ہوا و ہوس میں گرفتار ہیں، لیکن خود کو آزاد تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ بدترین قسم کی غلامی ہے،

نیست آزاد جز رہیدہ از ہوا

مرد آزاد تو وہی ہے جو خواہشات نفس سے چھٹکارا پا چکا ہو۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيْهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُوْنَ وَرَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی، ایک مرد ہے، اس میں کئی ضدی (آقا) شریک ہیں اور ایک مرد پورا ایک شخص کا ہے، کیا برابر ہوتی ہیں دونوں مثل، سب خوبی اللہ کے لئے ہیں، لیکن بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ (سورہ زمر: ٢٩)

شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ

”ایک غلام جو کئی کا ہو، کوئی اس کو اپنا نہ سمجھے، تو اس کی پوری خبر نہ لے، اور ایک غلام جو سارا ایک کا ہو، وہ اس کو اپنا سمجھے اور پوری خبر لے، یہ مثال ان کی ہے جو ایک رب کے بندے ہیں، اور جو کئی رب کے بندے ہیں۔“

اور جو کوئی نفس کی خواہشات کا غلام ہو وہ ایک رب کا بندہ کیونکر ہوگا، اسی لئے ہواو ہوس کا غلام، مدام کشمکش میں رہتا ہے، نفس کی تمام خواہشات کا پورا کرنا اس کے اختیار کی بات نہیں، اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے پس وہ ہمیشہ ایک الجھن میں رہتا ہے، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کا ایک دوہا ملاحظہ ہو، جس سے ایک کی اور کئی ایک کی غلامی کا فرق خوب واضح ہوتا ہے، فرماتے ہیں۔

جھہ کتا دَر دَر پھرے   دَر دَر دُر دُر ہوئے
ایک در کو تھام لے   کہے نہ دُر دُر کوئے

یہ بندہ جو ایک در کو تھام کو بیٹھ رہتا ہے، ہر دو عالم کی غلامی سے نجات پا جاتا ہے درحقیقت ''مرد کامل'' یہی ہے، یہی حقیقۃً مومن ہے، موحد ہے، اور پھر اس کے فیضان نظر سے بہت سے مرد کامل تیار ہوتے ہیں، یہ لوگ عرصۂ کائنات میں ''کبریت احمر'' ہیں، جن کا وجود برکت و رحمت کا مہبط و مورد ہوتا ہے، جن کے انفاس قدسیہ سے بیمار انسانیت شفاء پاتی ہے، کائنات انھیں کے ضرب ''اللہ ھو'' سے قائم ہے۔

فرمان نبوت ہے۔

لاتقوم الساعة حتی لایقال فی الارض اللہ اللہ

''قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب کہ زمین پر اللہ اللہ کہنا موقوف ہو جائے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اللہ کہنے والے ہی وجہ بقائے کائنات ہیں، پھر اللہ اللہ کہنے کے درجات ہیں، ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی زبان سے اللہ اللہ کہے، اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کے قلب و روح میں، اس کے رگ و ریشہ میں، اس کے اعمال و احوال میں، اس کے نظریہ و فکر میں اللہ کا تصور، اللہ کا ذکر سما جائے، رچ بس جائے۔

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اِنَّ الَّـذِیۡـنَ قَـالُـوۡا رَبُّـنَـا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡهِمِ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَنۡ لَّا

تَخَافُوْا وَلاَ تَحْزَنُوْا وَابْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. (سورۂ حم سجدہ: ۳۰)

”بلا شبہ جنھوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے، ان پر اترتے ہیں فرشتے کہ تم مت ڈرو، اور نہ غم کھاؤ، اور خوشخبری سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ تھا۔“

یہ استقامت کیا ہے؟ سنئے! ”دل سے اقرار کیا اور اس پر قائم رہے اس کی ربوبیت والٰہیت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا، نہ اس یقین واقرار سے مرتے دم تک ہٹے، نہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلا، جو زبان سے کہا تھا اس کے مقتضا پر اعتقاداً اور عملاً جمے رہے، اللہ کی ربوبیت کاملہ کا حق پہچانا، جو عمل کیا خالص اس کی خوشنودی اور شکرگذاری کے لئے کیا، اپنے رب کے عائد کئے ہوئے حقوق وفرائض کو سمجھا اور ادا کیا، غرض ماسوا سے منھ موڑ کر سیدھے اسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی کے راستہ پر چلے۔ (فوائد عثمانی)

یہی وہ درجہ ہے کہ بندہ اس مقام پر پہونچ کر حقیقی طور پر اللہ کا غلام بنتا ہے اور ماسوا کی غلامی سے نجات پاتا ہے، باقی سب تعلقات مضمحل بلکہ فنا ہوجاتے ہیں۔ ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

اس مرتبۂ بلند پر یعنی ”عبدیت کاملہ“ پر اصلاً تو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام فائز ہوتے ہیں، پھر جو ان کے اتباع اور پیری میں جس قدر مخلص اور سرگرم ہوتا ہے، اسی لحاظ سے اس مرتبہ تک چڑھتا چلا جاتا ہے، ایسے لوگ ہر زمانے میں ہوتے ہیں، قرون اولیٰ میں بھی تھے، قرون وسطیٰ میں بھی تھے اور بحمد اللہ دنیا پرستی کے اس دورِ سیاہ میں بھی ہیں، بیش وکم کا فرق ضرور ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ دنیا خالی ہوگئی ہو، اور جب دنیا ایسے لوگوں سے خالی ہوجائے گی تو اس کے باقی رکھنے کا قصہ بھی تمام ہوجائے گا۔

ہم اپنے ملک ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ جب تیرہویں صدی ہجری کا اختتام اور چودہویں صدی کا آغاز ہورہا تھا، جب یہاں مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہوچکا تھا، اور گوروں (انگریزوں) کے کالے دل کی سیاہی نکل نکل کر ملک کی فضا کو تاریک بنارہی

تھی عین اسی وقت میں حکمت الٰہیہ نے جابجا ایسے چراغ روشن کر دیئے تھے، جن سے قلوب میں ایمان کا نور جگمگا تا رہا۔

گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی علیہ الرحمہ (م: ۱۳۲۳ھ) کی درسگاہ اور خانقاہ تھی، دیو بند میں ان کے اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ (م: ۱۲۹۷ھ) کے تلامذہ ومتوسلین دارالعُلوم کی شکل میں دینی علوم کا ایک مرکز تعمیر کرنے میں مصروف تھے، گنج مرادآباد میں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب نوراللہ مرقدہٗ (م: ۱۳۱۳ھ) مرکز ہدایت بنے ہوئے تھے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی ثم المکی قدس سرہٗ (م: ۱۳۱۷ھ) گوکہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں جوار حرم اختیار کر چکے، مگر ان کا نور ایمان ومعرفت ہندوستان کو مسلسل منور کیئے ہوئے تھا، اسی طرح ملک کے ہر گوشے میں مختلف طاقتور شخصیتیں اپنی آستینوں میں ید بیضاء لئے بیٹھی تھیں جن سے بھولے بھٹکے ہوئے لوگوں کو روشنی اور راہ ملتی تھی۔

ٹھیک انھیں دنوں میں ہماری نگاہ ایک اور بزرگ اور طاقتور صاحب نسبت شخصیت پر پڑتی ہے۔ جو قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے ایک گوشے میں نور معرفت، سوزِ محبت اور حرارت ایمانی کی دولت لٹا رہی تھی، اس کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جو شخص یا جو علاقہ اس کی نگاہ میں آ گیا وہ بدعات وخرافات سے پاک ہو کر سنت وشریعت کے نور سے جگمگا گیا۔

آج اس مرد خدا کے جاننے والے کم ہیں، اور اس کے حالات سے واقفیت رکھنے والے اور کم ہیں، کیونکہ وہ اپنے کو گم ہی رکھنا چاہتا تھا، اس کا مقصد زندگی یہ تھا کہ لوگ اللہ کو جانیں اور پہچانیں، مخلوق کی جان اور پہچان کی کیا اہمیت ہے؟ خالق کا نور ایسا پھیلاؤ کہ اپنی شخصیت اس میں کھو کر رہ جائے، اور وہ اپنے اِس مقصد میں کامیاب ہو گیا، اسے اب لوگ نہیں جانتے، لیکن جس کی پہچان اس نے کرانی چاہی ایک عالم کا عالم اس کے طفیل میں اسے جان گیا۔

یہ بزرگ بدر الملۃ والدین حضرت **محمد چانُدْ شَاہْ** قدس سرہٗ تھے، ٹانڈہ کے رہنے والے تھے، ٹانڈہ سابق ضلع فیض آباد اور موجودہ ضلع امبیڈکر نگر کا ایک مردم خیز قصبہ ہے، جس کے قریب ایک طرف اجودھیا ہندوؤں کا مشہور مرکز ہے، اور دوسری طرف کچھوچھہ اہل بدعت کا مرکزی مقام ہے۔ سن ولادت کا صحیح علم ان سطور کے کاتب کو نہیں ہوسکا، اور حق یہ ہے کہ میں نے اس سلسلے میں زیادہ تحقیق وکاوش سے کام بھی نہیں لیا ہے، یہ کام مؤرخ کا ہے، میں اہل اللہ کے احوال وسوانح کو برائے تذکیر قلم بند کرتا ہوں اس کی کاوش نہیں کرتا کہ کب پیدا ہوئے، کب وفات ہوئی؟ آسانی سے یہ چیزیں دستیاب ہوتی ہیں تو ذکر کر دیتا ہوں۔

حضرت مولانا محمد جمیل انصاری رحمۃ اللہ (۱) تحریر فرماتے ہیں کہ:

’’حضرت ممدوح قصبہ ٹانڈہ محلّہ سکراول ضلع فیض آباد اپنے وطن مالوف میں ابتدائے شباب یعنی ۱۸؍سال کے سن سے عزلت گزیں تھے .... اور تادم وصال چھپن برس تک اپنے مرکز سے نہیں اٹھے۔ (کلیات نعمت، ص: ۱۲۳)

اس تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب کی عمر مبارک ۷۴ برس ہوئی تھی اور وصال ۲۷؍ذی الحجہ ۱۳۱۷ھ میں ہوا، اس حساب سے ولادت ۱۲۴۴ھ کے آس پاس ہوئی ہوگی، یہی سن ولادت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کا بھی ہے۔

حضرت شاہ صاحب کو بچپن ہی سے عبادت کا ذوق تھا، ابتدائے شباب میں ہی اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب نصیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور ۱۸؍سال کی عمر میں اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

---

(۱) حضرت مولانا محمد جمیل انصاریؒ ضلع سیوان کے ایک بڑے صاحبِ علم بزرگ تھے، عرصہ تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شیخ الحدیث رہے۔ حضرت چاند صاحبؒ کے برگزیدہ خلیفہ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب سیوانی کے خلیفہ تھے، انھوں نے حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کی تحریرات کلیات نعمت کے نام سے مرتب فرمائی ہیں۔

کلیات نعمت میں لکھا ہے کہ:

حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب نصیرآبادی قدس سرہٗ آپ کے پیرومرشد نے ارشاد فرمایا کہ:

ٹانڈہ میں جا کر عزلت نشین ہوجاؤ، حسب ارشاد گوشہ نشینی اختیار فرمائی اور تادم وصال ۵۶/برس تک اپنے مرکز سے نہیں اٹھے، الّا بغرض ادائے حج۔ (ص:۱۲۲)

اس عزلت نشینی کی داستان بہت دلچسپ اور نہایت سبق آموز ہے، حضرت چاند شاہ صاحب قدس سرہٗ کے مفصل حالات کہیں قلم بند نہیں کئے گئے، نہ شاہ صاحب کو اس سے کوئی دلچسپی تھی، اور نہ اپنے خدام ومتوسلین کو اس طرف متوجہ ہونے دیا اس لئے تحریری حوالہ دینا ممکن نہیں، البتہ ان کے متوسلین ومتعلقین سے کچھ باتیں سننے کو ملیں، روایت کرنے والے محتاط اور معتبر ہیں، اس لئے ان روایات کے نقل کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

ان روایتوں کی استنادی حیثیت کو یہاں واضح کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس مضمون میں بعض احوال وواقعات تو مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے واسطے سے درج ہوں گے یہ واسطہ اتنا پختہ ہے کہ اس میں کلام کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور یہ احوال وواقعات حضرت مصلح الامت کے مواعظ وملفوظات میں مطبوع ہیں۔

کچھ باتیں حضرت مولانا مفتی محمد حنیف صاحب جونپوری مدظلہٗ کے حوالے سے درج ہوں گی حضرت مفتی صاحب کا متورع اور محتاط ہونا واقفین پر پوشیدہ نہیں ہے، مفتی صاحب مدظلہٗ ایک طویل مدت تک حضرت مصلح الامتؒ کی صحبت میں رہے ہیں، نیز وہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے خاص شاگرد ہیں، اور مولانا عبدالحلیم صاحبؒ حضرت شاہ صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے شاگرد ہیں، ان دونوں واسطوں کی وجہ سے مفتی صاحب کے بیان کردہ معلومات ضرور معتبر ہوں گی۔

بعض حکایات مشہور عالم دین حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب اعظمی ثم جلالپوری

علیہ الرحمۃ سے میں نے سنی ہیں، مولانا ضمیر احمد صاحبؒ کا بھی حضرت چاند شاہ صاحبؒ کے سلسلہ وخانوادہ سے خاص تعلق تھا، حضرت چاند شاہ صاحب کے ایک خلیفہ لپری ضلع جونپور کے رہنے والے حضرت سلطان شاہ صاحب تھے، ان کے پوتے حضرت مولانا جمیل احمد نوراللہ مرقدہٗ تھے جو کہ مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج کے مہتمم تھے، مولانا ضمیر احمد صاحب انھیں مولانا جمیل احمد صاحب کے مخصوص تلامذہ میں تھے، انہیں اپنے استاذ کے گھرانے سے حضرت شاہ صاحب کے سلسلے میں معلومات حاصل ہوئے تھے، بہر حال اس مضمون کا زیادہ تر مدار انھیں تینوں بزرگوں کے ارشادات پر ہے، اسکے علاوہ اگر کوئی بات ذکر کی جائے گی تو اس کا حوالہ پیش کر دیا جائے گا۔

جملہ معترضہ ذرا لمبا ہوگیا، میں نے یہ عرض کیا تھا کہ حضرت چاند شاہ صاحب نوراللہ مرقدہ کی عزلت نشینی کی داستان دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی، اور یہ داستان میں نے حضرت مولانا مفتی محمد حنیف صاحب مدظلہٗ سے سنی ہے، واقعہ یہ ہوا کہ ان کے شیخ ومرشد نے جب انھیں اجازت وخلافت سے نوازا، تو ارشاد فرمایا کہ ٹانڈہ میں ایک جگہ جم کر بیٹھ جاؤ، کسب معاش کا کوئی ذریعہ نہ اختیار کرنا، (۱) جو کوئی طالب آئے اسے اللہ کا نام سکھانا، کسی انسان سے کوئی حرص وطمع نہ کرنا، بس اللہ پر توکل کر کے بیٹھ رہو۔

شاہ صاحب جب گھر لوٹ کر آئے تو والد گرامی سے مرشد کی نصیحت کا تذکرہ کیا، اور کہا کہ میں تو اپنے شیخ کے حکم کے مطابق مسجد کے کسی حجرے میں بیٹھوں گا، کسب معاش کا

---

(۱) حضرت مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمہ جب کسی شخص کو بیعت وتلقین کی اجازت دیتے تو اس سے یہ بھی عہد لیتے کہ کسب معاش کا کوئی دنیوی طریقہ نہ اختیار کروگے، تاکہ یکسوئی کے ساتھ خدمت دین ہوسکے اور یہ بھی حکم دیتے کہ نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہ اس کا دل میں ارادہ کرنا، جو کچھ حق تعالیٰ بغیر طلب کے دیدیں اس پر اکتفا کرنا، معمولات مظہریہ میں اس کی تفصیل ان کے خلیفہ حضرت شاہ نعیم اللہ بہرائچی قدس سرہٗ نے لکھی ہے، چاند شاہ صاحب اسی سلسلے کے بزرگ خلیفہ ہیں۔

کوئی ذریعہ نہیں اختیار کروں گا، آپ سمجھ لیجئے کہ آپ کا یہ بیٹا مر گیا، مرا ہوا نہ خود کوئی مطالبہ کرے گا اور نہ اس سے کوئی چیز طلب کی جائے گی والد نے فرمایا چونکہ تم اپنے مرشد کے حکم سے ایسا کر رہے ہو، اس لئے ہم کو تمہاری بات بخوشی منظور ہے۔ البتہ ایک درخواست تم سے یہ ہے کہ اگر ہم اپنے حصے کے کھانے میں کچھ بچا کر تمہارے پاس کھانے کے واسطے بھیجیں تو اسے واپس نہ کر دینا، اسے قبول کر لینا، حضرت نے اسے منظور فرمایا۔

پھر اہلیہ سے کہا کہ میرے شیخ کا یہ حکم ہے، اب تم بتاؤ کہ کیا کرو گی، میرے ساتھ گذر بسر دشواری سے ہوگا، کبھی کھانے کو ملے گا، کبھی فاقہ ہوگا، تنگدستی ہوگی میں کمائی کا ذریعہ نہیں اختیار کروں گا، اگر تمہارے لئے یہ مشکل ہو تو میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کر دوں، تم اپنا نکاح کہیں کر لو، اور اگر اسی فقر و فاقہ کے ساتھ رہنا منظور ہے تو بہت اچھا، اہلیہ نے جواب دیا میں آپ ہی کے ساتھ رہوں گی، جس حال میں اللہ تعالیٰ رکھیں۔

پھر حضرت شاہ صاحب اس طرح بیٹھے کہ پیغام اجل پر ہی اٹھے، ۱۸؍سال کی عمر سے ۷۴؍سال کی عمر تک ۵۶؍برس انھوں نے کس طرح گذارے، اتنی مدت کے بعد اب کون بتا سکتا ہے، کہنے والا صرف یہ کہہ کر کہ

”ایام قیام وطن میں اکثر فاقہ کی نوبت آئی، مگر نہایت صبر و استقلال سے کام لیتے۔“ (کلیات نعمت، ص:۱۲۲)

خاموش ہو جاتا ہے، اور واقعہ یہی ہے کہ جو شخص ابتدائے شباب ہی سے ترک کسب کر کے محض خدا کے توکل پر بیٹھ گیا ہو، ایسا نہیں ہے، دونوں تینوں وقت سجا سجایا دسترخوان آسمان سے اس کے لئے نازل ہو جایا کرے، بلکہ اس کی آزمائش ہوتی ہے اور سخت آزمائش ہوتی ہے کہ اگر نااہل ہے تو فیل ہو کر بھاگ نکلے، اور اگر صاحب استقامت ہے تو ہر پہلو سے اس کا امتحان ہو جائے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ کی طرف سے صاحب توفیق تھے، فاقے، تنگدستیوں نے پریشان کیا، سخت سے سخت حالات آئے، مگر اس

کوہِ وقار و استقامت کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی، نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا، نہ دل کے دروازے میں حرص وطمع کو گھسنے دیا، اور نہ خدا کے علاوہ کسی اور کا دروازہ دیکھا، ایک مدت اسی حال پر گذری، کبھی حالت سخت ہوجاتی، فقر وفاقہ کی شدت ہوجاتی تو۔

”اس وقت کچھ کرامت صادر ہوتی جس سے بھوک پیاس کی شدت رفع ہوجاتی۔“ (کلیات نعمت۔ ص:۱۲۲)

غرض یہ کہ حضرت شاہ صاحب نہایت استقلال کے ساتھ اپنے اسی کام میں منہمک رہے، جس کا حکم ان کے شیخ نے دیا تھا۔

مشہور محدث حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مئوی نوراللہ مرقدہٗ جو حضرت گنگوہی کے شاگرد رشید، اور حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی اور دوسرے علماء کبار کے استاذ تھے، وہ اور ان کا پورا خاندان حضرت چاندشاہ صاحب سے بیعت تھا۔

انھیں مولانا عبدالغفار صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالحسن صاحب اپنے رسالہ ضیاء الایمان میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> مولف رسالہ کے والد بزرگوار شیخ عبداللہ صاحب مئوی مرشد کامل مقتدانا حضرت چاندشاہ کی مبارک خدمت میں تین برس تک رہے۔ والدصاحب مرحوم مغفور کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کئی روز فاقے ہوئے (والدصاحب مرحوم بھی اس وقت خدمت میں رہا کرتے تھے) تمام چودہ اشخاص علاوہ اہل وعیال کے مقیم خانقاہ تھے، بھوک کی پریشانی میں جب ہم لوگ حضرت مرشد قدس سرہٗ کا چہرہ دیکھتے تھے بھوک مرجایا کرتی۔ تین دین کے بعد آپ نے مریدوں کو بلاکر کہا کہ فاقہ دعوتِ خداوندی ہے یعنی اس سے مدارج میں ترقی ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کہ اب جی چاہتا ہے کہ کوئی تدبیر کروں، اچھا! احاطہ میں گھوڑی بندھی ہوئی گھاس کھارہی ہے۔ اس کے پاس سے گھاس ہٹادو

اس کو دیں گے (یعنی اللہ تعالیٰ) ہم کو نہیں دیں گے۔ لوگوں نے فوراً گھاس ہٹا دی، اب وہ بھی فاقہ میں شریک کر لی گئی، تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص آیا اور دو روپے پیش کئے، آپ نے قبول فرمائے، اور اس کو دعائے خیر دے کر رخصت کیا، پھر لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو دو روپئے اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، مگر یہ بہت کم ہیں۔ لہٰذا جی چاہتا ہے کہ تجارت کروں، مریدین خاموش تماشا دیکھ رہے تھے، پھر آپ گوشہ سے اٹھ کر روانہ ہوئے، مریدین بھی پیچھے چلے کہ دیکھیں یہ کہاں جاتے ہیں؟ اور دو روپیہ لے کر آج تجارت کیا کریں گے؟ جب دروازہ پر پہونچے، ایک فقیر ایک طرف سے آ گیا، آپ نے اس کو دونوں روپئے دے دئے پھر آپ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے، کچھ عرصہ گزرا کہ ایک شخص خانقاہ میں آیا، اور ستر روپئے اور کچھ کپڑے وغیرہ پیش کئے، آپ نے مریدوں سے کہا کہ دیکھا ہم نے تجارت کی تو کس قدر نفع ہوا، اس کے بعد حسب عادت مستمرہ چالیس دن کی خرچی منگائی، باقی سب فقراء وطلبہ کو تقسیم کر دیا، شام تک نہیں رکھا، **سبحان اللہ**. کس قدر استغناء دل کے اندر تھا، اور خدا پر توکل اور اس کے وعدہ پر یقین۔ **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء و اللہ ذو الفضل العظیم**. (ص۳۳)

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب نے حضرت چاند شاہ صاحب کی مدحت میں طویل نظم لکھی ہے۔ اس میں فرماتے ہیں۔ ؎

شہر یاران قناعت کے تھے افسر چاند شاہ
جس طرح سب اختروں کا ہے یہ اختر چاند شاہ
قطب تھے اور جا گزیں تھے قطب کے مانند وہ
مثل سورج کے نہیں پھرتے تھے در در چاند شاہ
بوریائے فقر پر بیٹھے وہ ایسے شوق سے
تادم مردن نہ اٹھے اس سے دم بھر چاند شاہ

تھی قناعت اور توکل آپ کی روحی غذا
کچھ نہیں رکھتے تھے حرص لعل و گوہر چاند شاہ

فقر و فاقہ کے ابتلائی دور کو آپ نے نہایت کامیابی کے ساتھ گذار دیا، اس کے بعد فتوحات کا دور آیا، اور روزانہ آپ کی خانقاہ میں دولت، بارش کی طرح برسنے لگی، لیکن شاہ صاحب کی سخاوت اور فیاضی کا حال یہ تھا کہ جو کچھ فتوحات دن بھر حاصل ہوتیں، سونے سے پہلے سب لٹا دیتے، ان کی رات کسی زر و مال پر نہ گزرتی، حضرت مولانا عبدالغفار صاحب فرماتے ہیں۔

گنج قاروں گر کوئی دیتا نہ رکھتے اپنے پاس
صاف کر دیتے تھے دم بھر میں لٹا کر چاند شاہ
پھینکتے خاشاک کے مانند اپنے ہاتھ سے
بے تکلف کیسۂ لعل و دُر وزر چاند شاہ
خرچ ان کا دیکھ کر کہتے تھے دنیا داریوں
دست غیب ان کو ہے یا ہیں کیمیا گر چاند شاہ

مفتی محمد حنیف صاحب مدظلہٗ نے سنایا کہ کسی عقیدت مند نے ایک روز حضرت کی خدمت میں بارہ بکرے بطور ہدیہ کے پیش کئے، حضرت نے اسی وقت حکم دیا کہ سب بکروں کو ذبح کرو، اور ان کا گوشت غریبوں میں تقسیم کرد، یا پلاؤ تیار کر کے سب کو کھلاؤ چنانچہ شام تک سب ختم ہو گیا، حضرت کے کسی صاحبزادے کو ایک بکرا پسند آ گیا، انھوں نے اسے روک لیا، ۲/ بجے شب میں جب حضرت تہجد کے لئے اٹھے تو بکرا اول رہا تھا، آپ نے فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ صاحبزادے کو یہ بکرا پسند آیا، انھوں نے اسے روک لیا ہے، آپ نے فرمایا کہ نہیں، اسے بھی کاٹو اور ابھی بانٹو، ورنہ جب میں حق تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ الٰہی روزی بھیجئے، میرے پاس کچھ نہیں ہے، تو یہ جھوٹ ہو جائے گا!

اب معلوم ہوا کہ روز آنہ شام کو سب دولت لٹا کر حضرت کا دست دعا اٹھتا تھا کہ پروردگار! خالی ہاتھ ہوں، روزی کا طالب ہوں، بے کس و بے نوا ہوں، یاوری کا خواستگار ہوں، پھر اللہ تعالیٰ تازہ روزی بھیجتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لوانکم تتوکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا وتروح بطانا. (رواہ الترمذی وابن ماجہ کمافی المشکوٰۃ)

اگر تم لوگ اللہ پر توکل کرو، جیسا کہ توکل کا حق ہے، تو اللہ تمہیں اسی طرح روزی دیں گے جیسے پرندوں کو دیتے ہیں، کہ صبح وہ خالی پیٹ اپنے گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور شام کو آسودہ ہو کے لوٹتے ہیں۔

پرندوں کو ہر روز تازہ روزی ملتی ہے، اسی طرح سچے متوکلین کو اللہ تعالیٰ ہر روز نئی اور تازہ روزی عنایت فرماتے ہیں، حضرت چاند شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ اس حدیث کے سچے مصداق تھے۔

حضرت چاند شاہ صاحب خالص مومن و موحد تھے، توحید میں ان کا قدم نہایت راسخ تھا، ان کے مریدین اور خلفاء میں بھی یہی رنگ غالب تھا، شرک و بدعت سے کوئی مصالحت انھیں گوارہ نہ تھی، یہی وجہ سے کہ جہاں جہاں ان کے لوگ تھے، یا ان کے خلفاء و متوسلین پہونچے، وہاں سے بدعات کا خاتمہ ہوگیا، اب بھی یہ اثر ان کے خاندان والوں میں اور ان کے سلسلے میں پایا جاتا ہے، ان کے پوتے حضرت مولانا ظہور الحسن صاحب مدظلہ (اب وہ بھی جوارِ رحمت میں پہونچ چکے ہیں، رحمہ اللہ) ابھی ماشاء اللہ سلامت باکرامت ہیں، نہایت متواضع اور خاشع خاضع بزرگ ہیں، ان کی خدمت میں ایک بار بیٹھنے کا اتفاق ہوا، ساری گفتگو توحید وسنت کے ذکر سے معمور تھی، اور انداز بیان ایسا کہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ ان کا دائمی حال ہے، حضرت شاہ صاحب کے خاندان کے متعدد بزرگوں سے مل چکا ہوں، تواضع و مسکنت کا ایک خاص اثر سب میں دیکھا۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب محدث مئوی اپنے قصیدہ میں فرماتے ہیں۔

اتباعِ سنتِ نبویؐ کا ایسا تھا خیال
برخلاف اس کے نہ چلتے مو برابر چاند شاہ
عاشقِ سنت تھے نفرت تھی، انھیں بدعت سے سخت
جانتے تھے بدعتی کو خر سے بدتر چاند شاہ

حضرت شاہ صاحب کن صفات کے حامل تھے اور اپنے متوسلین میں کن صفات کو دیکھنا چاہتے تھے، حضرت ہی کے سلسلے کے ایک بزرگ عالم حضرت مولانا ریاض احمد صاحب چمپارنی نوراللہ مرقدہٗ اپنے شیخ ومرشد حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب سیوانی قدس سرہٗ خلیفہ حضرت اقدس چاند شاہ قدس سرہٗ کا ایک ملفوظ نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

''ایک دفعہ فرمایا (حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب نے) جب میں ٹانڈہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک ایک انگلی بند کر کے فرمایا تھا کہ تم اپنا ہاتھ لاؤ، تمہیں وہ باتیں بتاؤں، میں نے اپنا ہاتھ پیش کیا، چنانچہ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

''دیکھو، یاد رکھو، فقیر کو ایسا ہونا چاہئے، جیسے سورج، جس کا فیض دوست دشمن سب پر عام ہے، اور جیسے زمین، جو سب کے پاؤں کے نیچے روندی جاتی ہے، اور کچھ شکوہ نہیں کرتی ہے، اور جیسے کوڑا جس نے چاہا نجاست سمیٹ کر اس کے سر ڈال دیا، اور کوڑا کچھ انکار نہیں کرتا، اور ایسا ہونا چاہئے جیسے سمندر، دنیا بھر کی نجاست اس میں پڑتی ہے، وہ کچھ نہیں بولتا، سب ناپاکوں کو پاک کرتا ہے۔ (مکاتیب ریاضیہ، ص:۹۶)

اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ درویش کے مزاج میں وسعت، حلم، تواضع اور خدمت گزاری ہونی چاہئے، یہی مزاج حضرت شاہ صاحب کا تھا اور اسی رنگ پر اپنے خلفاء کو ڈھالا تھا، شاہ صاحب کی تاثیر کا یہ کمال تھا کہ جس پر انھوں نے نظر ڈال دی وہ ان کا ہمرنگ ہوگیا۔

مولانا ابوالحسن صاحب رسالہ ضیاء الایمان میں لکھتے ہیں کہ:

اوائل زمانہ میں جب حضرت قدوۃ العارفین، رہنمائے سالکین مرشدنا حضرت چاند شاہ صاحب قدس سرہٗ ٹانڈہ میں عزلت گزیں ہوئے، تو ایک شیعہ آپ کا معتقد ہوکر آپ کے خدام میں داخل ہوا، اور مذہب باطل سے تائب ہوکر سنت جماعت میں داخل ہوا، اوراپنے گھر کے تمام لوگوں کو سنت جماعت بنالیا، اور حضرت کا معتقد کردیا، اورتعزیہ داری کا سب سامان جلاکر فنا کردیا ایک بھائی اس کا لکھنؤ رہتا تھا، جب محرم کا زمانہ آیا، تعزیہ کے خیال سے ٹانڈہ آیا، یہاں آکر دیکھا تو معاملہ دگرگوں ہے، نہ کوئی سامان ہے، نہ کوئی انتظام، اور خیالات میں تغیر ہے بہت ناراض ہوا اس کے بھائی نے قصہ کہہ سنایا کہ ہم لوگ حضرت کے ہاتھ پر تائب ہوگئے ہیں اور سامان تعزیہ سب جلادیا ہے۔

یہ سنتے ہی اس کے بدن میں آگ لگ گئی، اور تلوار میان سے نکال کر حضرت مرشد کی تلاش میں نکلا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا، حضرت کو کسی نے آکر قصہ سنایا، اور کہا کہ آپ مکان کے اندر چلے جائیے، آپ نے فرمایا کہ چپ رہو، خدا کے گھر سے بڑھ کر جائے پناہ کہاں ہے۔ اتنے میں وہ پہونچ گیا، اور کہا فلان شخص تمہیں ہو؟ آپ نے فرمایا مجھی کو کہتے ہیں، پھر کہا آپ ہی تعزیہ کو منع کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں کیا خود خدائے عزوجل منع فرماتے ہیں۔ لاؤ قرآن مجید میں دکھلاؤں، قرآن مجید مسجد میں موجود تھا۔ اس نے چاہا کہ ہاتھ لگاؤں، آپ نے فرمایا خبردار بلا وضو ہاتھ نہ لگانا، وہ تلوار رکھ کر وضو کرنے گیا۔ جب وضو کرکے آیا، اور قرآن شریف لے کر پہونچا، آپ نے سورہ صافات کی آیت کا ٹکڑا نکال کر دکھلایا اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ یعنی تم اس چیز کو پوجتے ہو، جسے خود تراشتے اور بناتے ہو۔ پھر فرمایا ترجمہ اس کے ساتھ موجود ہے، دیکھ اس سے تعزیہ کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، اگر میرا یقین نہ ہو، کسی اور عالم کے پاس جاکر اس کا معنی دریافت کر، اس نے کہا حضرت جب قرآن مجید میں ممانعت ہے، تو میں بھی توبہ کرتا ہوں، مجھے بھی مرید کرلیجئے۔ چنانچہ وہ بیعت ہوکر وہاں سے

واپس ہوا۔ ص ۳۴۔

آگے مولانا ابوالحسن صاحب لکھتے ہیں۔

احقر مولف رسالہ ۱۳۱۷ھ ماہ شوال میں حاضر خدمت ہوکر بیعت سے مشرف ہوا آپ نے اپنی داہنی جانب بیٹھا کر تھوڑی توجہ دی کہ اس کے اثر سے دل دنیا سے سرد ہوگیا آج تک (۱۳۴۲ھ) دنیا کی ہر چیز میں فنا نظر آتی ہے کوئی چیز باعث انہماک نہیں۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب محدث مئوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

کیا مجال اس کو کہ رکھے دل میں دنیا کی ہوس
شوق سے پوری توجہ کرتے جس پر چاند شاہ
سیکڑوں کو کردیا دُرویش کامل آپ نے
کیوں نہ ہو کامل تھے اور کامل کے افسر چاند شاہ

خلوت میں یکسوئی کے ساتھ یادمولیٰ میں منہمک ہونے اور بکثرت مجاہدات کرنے کا اثر یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحب کا قلب روشن قندیل بن گیا تھا، جس میں محبت الٰہی اور عشق، نبوی کی شمع فروزاں تھی۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب محدث مئوی ارشاد فرماتے ہیں ؎

آپ کا دل آئینہ سے بھی زیادہ صاف تھا
بالیقیں انوار وعرفاں کے تھے منظر چاند شاہ
دیکھتے تھے آئینہ کی طرح انوارِ خدا کو
رکھتے تھے پہلو میں ایسا قلب انور چاند شاہ

اس نورانیت کے ثمرات میں دل کی ایک کیفیت ہوتی ہے جسے ''کشف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ کیفیت اختیاری نہیں ہے، مگر بعض بزرگوں کو حق تعالیٰ کی جانب سے یہ نعمت اتنے افراط سے ملتی ہے کہ بظاہر اختیاری چیز معلوم ہونے لگتی ہے، حضرت چاند صاحب قدس

سرہٗ اسی شان کے بزرگ تھے۔

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں شاہ صاحب کے کشف کے بعض واقعات متعدد جگہوں پر منقول ہیں، آپ نے فرمایا کہ ایک شخص حضرت چاند شاہ صاحب کی خدمت میں مرید ہونے کی نیت سے چلا، دیہاتوں کی عام عادت کے مطابق اس کی طبیعت میں احتیاط کم تھی، راستے میں گنے کا کوئی کھیت پڑا، اس نے ایک گنا توڑ لیا اور اسے چوستے ہوئے آگے بڑھ گیا، جب حضرت کی خدمت میں پہنچا تو شاہ صاحب نے پوچھا کہ بھیا کیسے آئے، اس نے کہا کہ مرید ہونے کے لئے، فرمایا تب راستہ میں تم نے اوکھ (گنا) کیوں توڑی تھی، اس پر وہ ششدر رہ گیا اور آئندہ توبہ کی۔

اسی طرح ایک شخص اپنے باغ کے آم ایک تھیلے میں رکھ کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ہدیہ کرنے کی نیت سے لے کر چلا، راستے میں ایک باغ پر گزر ہوا، دیکھا کہ ایک بڑا سا آم ٹپکا ہوا ہے، اسے بھی اٹھا کر تھیلے میں رکھ لیا، اور شاہ صاحب کی خدمت میں پہونچ کر تھیلے کو پیش کیا، شاہ صاحب نے اپنے اخلاق کریمانہ سے اسے قبول کیا اور خوشی کا اظہار فرمایا، لیکن تھیلا لے کر اسے الٹ دیا اور اسی بڑے آم کو ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ یہ بھی ہمارے ہی لئے ہے اور اسے واپس کر دیا اور تنبیہ فرمائی۔

حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب علیہ الرحمۃ ایک مجلس میں فرما رہے تھے کہ پیری ضلع جونپور کے سلطان شاہ صاحب کو جب خدا کی طلب غالب ہوئی تو وہ پیر ومرشد کی تلاش میں نکلے اس زمانہ میں پیری مریدی کے لئے کچھوچھہ کی خانقاہ اس حلقے میں مشہور تھی، سلطان شاہ وہیں پہنچے، اس وقت کے سجادہ نشین بہت وجیہ وشکیل، خوش قامت تھے، خوب صورت گورا چٹا چہرہ اور اس پر سفید ریش بہت پرکشش تھی، ملاقات ہوئی تو پیر صاحب نے پوچھا کیسے آئے بھئی، سلطان شاہ صاحب نے عرض کیا پیر کی تلاش میں نکلا ہوں، کوئی اچھا پیر ملے گا تو مرید ہوں گا پیر صاحب نے فرمایا جلدی سے وضو کر کے آجاؤ، میرے جیسا پیر تم کو کہیں نہیں ملے گا

میں ابھی مرید کرتا ہوں، شاہ صاحب نے فرمایا کہ جلدی نہیں کرنی ہے، بازار میں آدمی ایک پیسے کی ہانڈی خریدتا ہے تو وہ بھی اسے ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی خرابی تو نہیں ہے اور یہ تو پیر کا معاملہ ہے، جس پر دین وایمان کا مدار ہے، میں یہاں دو تین دن رہ کر دیکھوں گا، دل مطمئن ہوگا تو بیعت ہوں گا، پیر صاحب آج کل کی طرح شاطر درویش نہ تھے، انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے رہو، شاہ صاحب دو تین دن رہے، انھیں اطمینان نہیں ہوا، وہ رخصت ہونے کے لئے پیر صاحب کے پاس پہنچے تو پیر صاحب نے فرمایا وضو کر کے آئے ہو شاہ صاحب نے کہا نہیں، دل میں کہا یہاں تو دنیا داری ہے، میں بیعت نہیں ہوں گا،، پیر صاحب نے کہا کہ اچھا تو جاؤ، سلطان شاہ صاحب وہاں سے واپس آئے، اکبر پور پہنچے، ٹرین پر بیٹھ چکے تھے، کہ ایک جان پہچان والے سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے خیریت پوچھی، سفر کا مقصد دریافت کیا، شاہ صاحب نے سب بتا دیا، انھوں نے کہ کہ ابھی گھر نہ جائیے ٹانڈہ میں ایک بزرگ ہیں چاند شاہ صاحب، انھیں بھی دیکھ لیجئے، شاید طبیعت کو اطمینان ہوجائے، شاہ صاحب ٹرین سے اتر گئے، اور دوسری ٹرین سے ٹانڈہ پہنچ گئے، حضرت چاند شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے شاہ صاحب نے خاطر مدارات کے بعد پوچھا کہ کیسے آنا ہوا، انھوں نے عرض کیا کہ پیر کی تلاش میں نکلا ہوں، شاہ صاحب نے فرمایا کہ بہت مبارک خیال ہے، جوان آدمی ہو تلاش کرو، اگر کوئی اللہ والا پیر مل جائے تو مجھے بھی بتانا میں بھی حاضر ہوں گا، انھوں نے عرض کیا کہ سنا ہے کہ آپ بھی پیر ہیں، شاہ صاحب نے فرمایا نہیں بھائی یہاں کیا دھرا ہے؟ سلطان شاہ صاحب نے عرض کیا تب بھی میں دو تین دن رہوں گا، شاہ صاحب نے بخوشی اجازت دی، وہ رہ گئے شاہ صاحب کی عبادت وریاضت، زہد وتقویٰ اور اخلاق حمیدہ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور دوسرے ہی دن عرض کیا کہ حضرت بیعت ہونا چاہتا ہوں، اس وقت حضرت شاہ صاحب کی جیب میں چند سکے تھے، انھوں نے ہاتھ جیب میں ڈال کر بجایا اور فرمایا کہ یہاں تو دنیا داری ہے، یہاں بیعت ہونے سے کیا

فائدہ؟ سلطان شاہ کو کچھوچھہ والا اپنا جملہ یاد آ گیا، وہ اور گرویدہ ہو گئے، پھر بیعت ہو گئے، اور سلوک کے تمام مقامات طے کر کے خلیفہ مجاز ہوئے، یہ سلطان شاہ صاحب حضرت مولانا جمیل احمد صاحبؒ کے دادا تھے۔

حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب علیہ الرحمۃ نے حضرت چاند شاہ صاحب قدس سرہٗ کا ایک اور عجیب واقعہ ذکر فرمایا، جسے آج کا مادیت زدہ ذہن آسانی سے قبول نہیں کرے گا، لیکن جو لوگ کرامات اولیاء کے معتقد اور قائل ہیں، ان کے لئے اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے، اس سے شاہ صاحب کی قوت کشفیہ اور تاثیر دعا کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ پھولپور کے اطراف کے ایک صاحب حضرت چاند شاہ صاحب کے مرید تھے وہ بیمار ہوئے، انھوں نے اپنے ایک عزیز کو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں دعا کرانے اور تعویذ لینے کے لئے بھیجا، شاہ صاحب کی عام عادت یہ تھی کہ جب بھی کوئی شخص آتا پہلے اس کی خاطر مدارات کرتے، پھر مقصد دریافت فرماتے، لیکن یہ شخص گرمی کی دوپہر میں ٹانڈہ حضرت کی خانقاہ میں پہنچا، حضرت سے ملاقات ہوئی، حضرت نے خلاف معمول فوراً پوچھا کہ کیسے آئے؟ اس نے پوری بات عرض کی، آپ نے دعا کی اور فوراً تعویذ لکھا، اور فرمایا کہ ایک دم بھاگے چلے جاؤ کہیں رکنا مت، اور روٹی اور گڑ لے لو، راستہ میں کہیں کھیت میں پانی چل رہا ہو تو کھا کر پانی پی لینا اور جس حالت میں مریض ہو۔ اسے ضرور باندھ دینا، وہ بیچارہ الٹے پاؤں بھاگا، ادھر یہ ہوا کہ وہ شخص مر گیا، لوگ اس کا انتظار کرتے رہے، پھر غسل وغیرہ دے کر کفن پہنا کر نماز جنازہ پڑھ لی اور تھوڑا انتظار کر کے اسے قبر میں اتار دیا، اتنے میں دور سے وہ آدمی آتا ہوا دکھائی دیا، لوگ رک گئے، وہ آدمی دوڑتا ہوا آیا، اور ساری بارت سنائی اور کہا کہ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ مریض جس حالت میں ہو اسے تعویذ پہنا دینا، لوگوں نے کہا کہ یہ مر گیا ہے، اب تعویذ پہنانے سے کیا فائدہ؟ مگر شخص مذکور نے کہا کہ نہیں، حضرت کا حکم ہے تو اسے پہنایا جائے گا، لوگوں میں اختلاف

رائے ہوا، مگر اس شخص مذکور کے اصرار، حضرت کے حکم، اور اس کی گرمی کے موسم کی سخت دوڑ دھوپ کے پیش نظر یہ طے ہوا کہ تعویذ پہنا دیا جائے گو بے فائدہ ہی ہو، لیکن پہناتے ہی عجب تماشہ ظاہر ہوا، اس مردے میں حرکت ظاہر ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد سانس آنے جانے لگی، لوگوں نے فوراً قبر سے باہر نکالا، پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ زندہ واپس اپنے گھر آ گیا، بعد میں اطباء نے توجیہ کی کہ اسے سکتہ ہو گیا تھا، سکتہ کے مرض میں آدمی بالکل مردہ کی طرح ہو جاتا ہے، صحیح شناخت نہ ہو تو لوگ دفن کر دیتے ہیں، یہاں یہی قصہ ہوا اور اگر بالفرض مر بھی گیا ہو تو کیا خدا کی رحمت سے یہ کچھ بعید ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کر دیا جائے۔ **وما ذالک علی اللہ بعزیز۔**(۱)

واقعہ یہ ہے کہ حضرت چاند شاہ صاحب آیۃ من آیاتِ اللہ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت کام لیا، یوپی کے کئی اضلاع اور اسی طرح بہار کے متعدد اضلاع کی اصلاح حضرت شاہ صاحب کی وجہ سے ہوئی، شیخوپور جہاں مدرسہ شیخ الاسلام ہے۔ یہ پورا خطہ حضرت شاہ صاحب کے متوسلین سے فیضیاب ہے، اور اس وجہ سے اس علاقہ میں بدعات اور بریلویت کا زور نہیں ہے۔

حضرت کے مریدین ومتوسلین بے شمار تھے، جن میں اجلۂ علماء بھی تھے، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کے شاگرد، مولانا عبد الغفار صاحب مئوی، جو اپنے دور کے بے نظیر عالم اور محدث تھے، نیز محدثِ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کے خاص استاذ تھے، وہ حضرت چاند شاہ صاحب کے مرید وخلیفہ تھے، اسی طرح ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا ابو الحسن صاحب علیہ الرحمۃ بھی انھیں سے بیعت تھے، برہی

---

(۱) میرے دوست مولانا محمد عثمان معروفی، برادر خورد حضرت استاذی مولانا زین العابدین صاحب معروفی مدظلہ نے بتایا کہ یہ واقعہ موضع نیاؤج ضلع اعظم گڈھ کا ہے، اور اسے مرحوم مولانا بدر الدین اصلاحی سابق ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر نے بھی بیان کیا ہے۔

ضلع فیض آباد کے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب علیہ الرحمۃ جو حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب جونپوری نور اللہ مرقدہٗ کے استاذ تھے اور جید عالم تھے، وہ حضرت شاہ صاحب ہی سے بیعت اور ان کے خلیفہ تھے۔

۲۷/ذی الحجہ ۱۳۱۷ھ شب شنبہ کو آپ کا وصال ہوا اور ٹانڈہ میں مسجد کے سامنے قبرستان میں دفن ہوئے۔

غالباً ۴/اپریل ۱۹۹۹ء کو میری حاضری ٹانڈہ ہوئی، حضرت چاند شاہؒ کے حفید رشید مولانا ظہور الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی، میں نے حضرت چاند صاحب قدس سرہٗ کی قبر دریافت کی، تو انھوں نے جگہ بتائی، قبر کی کوئی ظاہری علامت وہاں موجود نہیں ہے، اگر مولانا نہ بتائیں تو ہر گز کوئی جان نہیں سکتا کہ یہاں کوئی مردِ خدا مدفون ہے، فنائیت کی یہ شان ہمارے ملک میں بہت نادر ہے، کہ اتنے اعلیٰ پایہ کے بزرگ کا نشانِ قبر تک محفوظ نہیں ہے خیر، قبر کو کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، صاحب قبر کو وہ تو جانتا ہے جس کے لئے ان کا مرنا جینا تھا، اللہ تعالیٰ ان کے برکات سے امت کو نوازے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت چاند شاہ صاحب کے چند مشائخ کا بھی مختصراً تذکرہ کر دیا جائے۔ حضرت چاند شاہ صاحب کو جن مشائخ سے یہ دولت باطنی ملی تھی، ان کا تعلق سلسلۂ نقشبندیہ کی اس شاخ سے ہے، جس کا آغاز امام ربّانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ سے ہوا ہے، ان کے بعد اس ایک شاخ سے متعدد شاخیں معروف ہوئیں، جن سے دین اسلام کو تقویت پہونچی۔ ایک سلسلہ ان کے فرزند و جانشین حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب علیہ الرحمہ سے چلا۔ دوسرا سلسلہ ان کے جلیل القدر خلیفہ حضرت سیّد آدم بنوری علیہ الرحمہ سے شروع ہوا، اس دوسرے سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے نامور صاحبزادگان، پھر حضرت سیّد احمد شہید جیسی طاقتور اور گرانمایہ شخصیات ہیں

جن سے حق تعالیٰ نے دین اسلام کی حفاظت اور بقاء وترقی کا کام ہندوستان میں لیا۔ **شکر اللہ مساعیہم**

پہلا سلسلہ جو حضرت خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمہ سے چلا، اس کی بھی دو شاخیں خدمت دین وملت میں نمایاں ہوئیں، ایک شاخ تو ان کے صاحبزادے خواجہ محمد سیف الدین علیہ الرحمہ سے شروع ہوتی ہے، یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے درویش بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی تربیت فرمائی تھی، اس شاخ کی مرکزی شخصیت حضرت مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمہ کی تھی، حضرت مرزا صاحب بہت قوی النسبت اور عالی مرتبہ شیخ تھے، ان کے چند خلفاء سے دین اور دینی علم وعمل کی بڑے پیمانے پر نشر واشاعت ہوئی، وہ چند یہ ہیں:

(۱) حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ، صاحب تفسیر مظہری، انھیں شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی بیہقی وقت کہتے تھے، اور حضرت مرزا صاحب نے انھیں علم الہدیٰ کا لقب عنایت فرمایا تھا۔

(۲) حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی، ان کا سلسلہ بہت وسیع وعریض ہوا، اکابر دیوبند کے استاذ حضرت شاہ عبد الغنی صاحب قدس سرہٗ انھیں کے سلسلے کے عالم وبزرگ تھے۔

(۳) حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچی نور اللہ مرقدہٗ، ان کا ذکر آرہا ہے، حضرت چاند شاہ صاحب انھیں کے سلسلے کے بزرگ ہیں۔

خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمہ کے سلسلے کی دوسری شاخ ان کے دوسرے صاحبزادے خواجہ محمد نقشبند علیہ الرحمہ سے چلی، اس شاخ میں خواجہ محمد زبیر علیہ الرحمہ بہت عالی نسبت بزرگ ہوئے، اس سلسلے میں مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی ہوئے ہیں۔

حضرت چاند شاہ صاحب کے تذکرے میں گزر چکا ہے کہ ان کی تربیت حضرت شاہ ابوالحسن نصیرآبادی نے کی تھی، ان کے شیخ حضرت شاہ مراد اللہ تھانیسری ثم لکھنوی تھے، انھیں

اجازت بیعت وارشاد حضرت شاہ نعیم اللہ بہرائچی سے تھی، اور وہ خلیفہ تھے حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے! حضرت مرزا صاحب تو معروف ہیں، باقی تینوں حضرات کا تذکرہ مختصراً نزہۃ الخواطر مولفہ مولانا عبدالحی صاحبؒ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اخذ کرکے لکھا جاتا ہے۔

حضرت مولانا شاہ ابوالحسن نصیرآبادی علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ ابوالحسن صاحب ضلع رائے بریلی کے مشہور قصبہ نصیرآباد کے رہنے والے تھے، نصیرآباد، رائے بریلی سے پندرہ سولہ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، امیر المومنین حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہٗ کا آبائی خاندان ابتداءً نصیرآباد ہی میں مقیم تھا، بعد میں اس کا ایک حصہ رائے بریلی میں منتقل ہوگیا، اور ایک حصہ نصیرآباد ہی میں رہا۔ اسی خاندان سے حضرت مولانا شاہ ابوالحسن کا تعلق تھا، شاہ صاحب وہیں پیدا ہوئے، اور وہیں عرصہ تک تحصیل علم میں مصروف رہے، پھر لکھنؤ تشریف لے گئے اور حضرت مولانا تراب علی لکھنوی وغیرہ سے کتب درسیہ پڑھیں۔

وہیں لکھنؤ میں حضرت شاہ مراد اللہ تھانیسری سے بیعت ہوئے اور مدتوں ان کی صحبت میں رہ کر منازل سلوک وولایت طے کئے، جب ان کی تعلیم وتربیت مکمل ہوگئی تو شیخ ومرشد نے انھیں خلافت عطا فرمائی، انھوں نے یہ منصب بحسن وخوبی نبھایا اور طریقت کے حقوق پورے طور پر ادا کئے۔

حضرت مولانا شاہ ابوالحسن صاحب ایک باوقار، سنت نبوی کے سچے پیرو، نسبت قویہ کے حامل اور صاحب استقامت بزرگ تھے، ان سے لوگوں کو بہت فیض پہونچا۔

۲؍شعبان ۱۲۷۲ھ میں ان کا وصال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۱۵)

☆☆☆☆☆

حضرت شاہ مراد اللہ تھانیسری علیہ الرحمہ

حضرت شاہ مراد اللہ بن قلندر بخش عمری تھانیسری، نقشبندی مشائخ میں ایک قوی

النسبت بزرگ ہیں، تھانیسر صوبہ پنجاب کے رہنے والے تھے، بچپن میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ دہلی آگئے تھے، اس وقت حضرت مرزا مظہر جان جاناں باحیات تھے، چندے ان کی صحبت میں رہے، ان کی شہادت ہوگئی اور تھانیسر سکھوں کے ہاتھوں اجڑ کر تاراج ہوگیا، تو وہ لکھنؤ آگئے اور یہاں حضرت مرزا صاحب کے خلیفہ ومجاز حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچی کی خدمت میں راہ طریقت، سلسلۂ نقشبندیہ کے مطابق طے کی، اور ان کے منصب مشیخت پر رونق افروز ہوئے، اور بکثرت لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، اللہ نے انھیں بڑی مقبولیت عطا فرمائی تھی، ان کی روحانی شاب بہت بلند اور نسبت بہت قوی تھی، ان کے احوال وواقعات عجیب وغریب ہیں، بلند ہمت اور صاحب نسبت صحیحہ تھے، ان کے مریدین فیضان نسبت سے بہت جلد سرشار ہوجاتے تھے۔

۱۲۴۸ھ میں شہر لکھنؤ میں ان کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۵۱۴)

☆☆☆☆☆

حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچی علیہ الرحمہ

حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب ایک عالم باعمل، مرد بزرگ تھے، بہرائچ شہر میں ۱۱۵۳ھ میں ان کی ولادت ہوئی، علم اور بزرگی کے گہوارے میں ان کی پرورش اور نشو ونما ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے اساتذہ سے حاصل کی، پھر تحصیل علم کے بعد لکھنؤ اور دہلی کا متعدد مرتبہ سفر کیا، لکھنؤ میں مولانا محمد خلیل صاحب سے اور شاہجہاں پور میں مولانا امام بخش صاحب اور بریلی میں مولانا شہاب الدین صاحب سے تعلیم حاصل کی، پھر ۱۱۷۷ھ میں لکھنؤ آکر حضرت مولانا محمد ولی انصاری کی خدمت میں جم گئے، اور معقول ومنقول کی سب کتابیں ان سے پڑھیں، حساب اور فرائض کا علم مفتی عبد الرب صاحب لکھنوی سے حاصل کیا، پھر لکھنؤ ہی میں ان کی ملاقات شیخ محمد جمیل نقشبندی سے ۱۱۸۶ھ میں ہوئی، ان کے ساتھ وہ کافی مدت تک رہے، اور ان سے انھوں نے سلسلۂ نقشبندیہ میں اذکار واشغال

حاصل کئے۔

پھر دہلی کا سفر کیا، اور وہاں شیخ کبیر حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے، اور چار سال ان کی صحبت میں رہ کر ریاضت ومجاہدہ کرتے رہے، اور مراتب سلوک وولایت کے مقام بلند پر فائز ہوئے، انھوں نے آپ کو اجازت مطلقہ دی۔

پھر لکھنؤ تشریف لائے اور یہاں بیعت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ عرصہ تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد پھر دہلی تشریف لے گئے، پھر وہاں سے پانی پت گئے اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی صحبت میں تقریباً ایک سال رہے، اور ان سے فیوض وبرکات حاصل کئے، پھر دوبارہ آئے اور باقی زندگی بہرائچ میں بسر کی، وہاں بھی انھوں نے بیعت وارشاد کا بازار گرم رکھا۔

حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب جہاں بہت بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے وہیں بہت بڑے عالم بھی تھے، انھوں نے میر زاہد رسالہ پر اور ملا جلال پر حاشیہ لکھا تھا، نیز اپنے شیخ حضرت مرزا صاحب کے مکتوبات جمع کئے تھے، اور ان کے طریقہ ومعمولات کو تفصیل سے مرتب کیا، جس کا نام ”بشارات مظہریہ“ ہے، پھر اس کی تلخیص ”معمولات مظہریہ“ اور ”انفاس اکابر“ کے نام سے کی، ۱۲۱۸ھ میں وفات ہوئی۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت شاہ محمد نعمت اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ

المتوفی ۱۳۴۸ھ

اللہ تعالیٰ نے جس طرح خاتم النبیین سیدنا ومولانا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو تمام انبیاء پر فضیلت بخشی ہے، اسی طرح آپ کی امت کو تمام امتوں پر فوقیت بخشی ہے، یہ امت ہر لحاظ سے نہایت زرخیز تھی اور اب بھی ہے، علم وفضل کے جیسے جیسے شاہ کار اس امت میں پیدا ہوئے، اور علم کے جتنے خزانے اس امت نے لٹائے ہیں، پچھلی کسی امت میں اس کی مثال نہیں ملتی، ذکاوت وذہانت جتنی فیاضی کے ساتھ اس امت کو بخشی گئی، اور حافظہ اور یادداشت کی جیسی قوت اس امت کو نصیب ہوئی ہے اب تک کی دنیا اس کے مثال سے خالی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کا جو اصل مقصد ہے، اور تمام علوم وفنون اور تمام صلاحیتیں جس مقصد کے لئے بطور خدمت گزار ہیں یعنی اپنے خالق سے صحیح ربط وتعلق، اس کی بندگی اور اس کے حضور دل وجان سے سرافگندگی اس پر کامل توکل واعتماد، اس سے بے تابانہ محبت وعشق اور بغیر وسوسہ اور دغدغہ کے اس پر یقین جازم اور ایمان کامل! اس مقصد اصلی کی تکمیل کے جتنے اعلیٰ نمونے جتنی فراوانی سے اس امت کے ہر دور میں نظر آتے ہیں، اس کا عشر عشیر بھی دوسری اقوام وملل میں ڈھونڈھا نہیں جاسکتا ہے۔ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تو اس کے اکمل ترین نمونے تھے، ان کے بعد بھی اتنی کثرت سے اللہ والے پیدا ہوئے کہ ان کی گنتی ممکن نہیں ہے، ہر دور میں ہر جگہ اور ہر قوم وبرادری میں بکثرت، ایسے لوگ ہوئے جنھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ، اپنی ہر خواہش ہر ضرورت اور اپنی ہر صلاحیت خدا کے لئے

وقف کر دی، ان کی ذات اعلائے کلمۃ اللہ کی علامت بن گئی، ان کی زندگی، ان کی موت، ان کی حرکت، ان کا سکون، ان کی گویائی، ان کا سکوت، ان کی دوستی، ان کی دشمنی، ان کی خلوت، ان کی جلوت صرف اور صرف اللہ کے لئے ہوتی رہی۔ وہ **قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین.** (تم کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میری حیات اور میری زندگی صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہے) کے سچے مصداق تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ ؎

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام ہے اپنے کام سے
ترے ذکر سے، تری فکر سے تری یاد سے ترے نام سے

آیئے! تحریر وقلم کی اس مجلس میں ایسی ہی ایک شخصیت کا ذکر کیا جائے جس نے اللہ کے لئے اپنا سب کچھ فنا کر دیا۔ جس کے حالات سن کر اور جس کے احوال وکوائف پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ والوں کا رنگ کیا ہوتا ہے، اور ان کی شان کیا ہوتی ہے۔

یہ اس دور کے بزرگ ہیں، جب ہندوستان میں مغل حکومت کا چراغ جھلملا جھلملا کر بجھ چکا تھا۔ اور دیوبند کے افق پر علوم نبوت کا ایک آفتاب تازہ طلوع ہو رہا تھا۔ اکابر دیوبند اپنی تمام ہمت وسعی اس بات پر مرکوز کئے ہوئے تھے کہ حکومت کا چراغ بجھے تو بجھے لیکن دین کا چراغ اس ملک میں بجھنے نہ پائے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کی رہنمائی ورہبری میں ان کے دو بڑے خلفاء کواکب کی ایک انجمن سجا رہے تھے، اسی دور میں یو. پی. کے ایک مشرقی ضلع فیض آباد کے ایک قصبہ ٹانڈہ میں حضرت چاند شاہ صاحب اپنی روشنی سے ستاروں کا ایک حلقہ بنا رہے تھے، وہ ان روشن ستاروں کو مختلف ظلمت زدہ علاقوں میں بھیج کر روشنی کا ماحول تیار کر رہے تھے، ان کی ہدایت کا فیض دور ونزدیک مسلسل پہونچ رہا تھا اسی دور میں غالباً چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں بہار کے ضلع سیوان سے چل کر ایک جوان سعادت مند حضرت چاند شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں

داخل ہوتا ہے، اس کے چہرے پر نعمت الٰہی کے آثار صاف نمایاں تھے۔

وہ واقعی اللہ کی نعمت تھا، اور والدین کی طرف سے اس نے نام بھی ''نعمت اللہ'' پایا تھا۔ وہ شاہ صاحب کی خدمت میں مدت دراز تک رہے، اور ایک بار وہ اور ان کے ایک رفیق شاہ صاحب سے رخصت ہو رہے تھے، تو شاہ صاحب نے دل کی گہرائیوں سے ایک دعا دی تھی، ''اللہ تم دونوں کو صدیق بنائے'' اور پھر واقعۃً وہ صدیق بنے۔

یہ شاہ نعمت اللہ صاحبِ قدیم ضلع سارن کے شہر چھپرہ سے تقریباً پچاس میل شمال و مغرب کے گوشہ میں ایک گاؤں ''نوتن ہرّیا'' میں پیدا ہوئے، سن ولادت آپ کا ۱۲۶۸ھ ہے۔ والدین نے نام محمد نعمت اللہ رکھا، بعد میں حضرت میاں اور شاہ صاحب کے لقب سے معروف ہوئے والد بزرگوار کا اسم گرامی شیخ امیر علی تھا۔

شیخ امیر علی صاحب گاؤں کے صاحب ثروت کاشتکار تھے، کاشتکاری کے ساتھ بڑی تعداد میں مویشی بھی ان کے یہاں تھے، شاہ نعمت اللہ صاحب ان کے بڑے صاحبزادے تھے، ابتدائی تعلیم انھوں نے گھر پر ہی ایک مولوی صاحب سے حاصل کی، اس زمانے میں مکتب کا رواج زیادہ نہ تھا، گھر پر قرآن کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید تعلیم دوسرے اساتذہ سے حاصل کی، آپ کے وطن موضع نوتن سے ڈیڑھ دو کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک بستی سانکھے خاص میں ایک غیر مسلم زمیندار کی ملازمت میں اعظم گڈھ کے ایک مولوی صاحب تھے، اس زمیندار نے اصلاً انھیں اپنے بچوں کو اردو فارسی پڑھانے کے لئے رکھا تھا، مگر اجازت تھی کہ دوسرے بچے بھی آکر فائدہ حاصل کریں، چنانچہ حضرت میاں صاحب نے بھی ان سے فارسی کتب درسیہ کی تکمیل کر لی، تو مولوی صاحب نے مشورہ دیا کہ قریبی گاؤں سمرا کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرو۔ سمرا کا فاصلہ نوتن سے دس کیلومیٹر ہے، میاں صاحب پیدل آتے جاتے تھے، برسات میں مجبوری میں تانگہ سے جاتے، برسات ختم ہوتی، تو پھر پیدل جاتے، سمرا سے قریب ایک بستی ''اندرواعباداللہ'' ہے، جہاں آپ کی آخری عمر

گذری اور وہیں آپ کی قبر شریف بنی، اندروا میں ایک بزرگ قاسم شہید کا مزار ہے، آپ وہاں جاتے اور دیر دیر تک وہیں بیٹھے رہتے، بچپن سے آپ کے مزاج پر درویشی غالب تھی۔

مدرسہ سمرا میں مولانا عبدالہادی صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب دو بہت ہی مشفق ومہربان استاذ ملے، انھوں نے نہایت شفقت ومحبت سے کافیہ وشرح جامی تک تعلیم دی۔ میاں صاحب بہت ذہین اور ذکی تھے، لیکن طبیعت پر درویشی اور بزرگی کا اثر چھایا ہوا تھا، اساتذہ نے مشورہ دیا کہ قدرِ ضروری علم حاصل ہو چکا ہے، اب کسی مرشد کامل کا دامن پکڑو اور معرفت وسلوک کی فضا میں ترقی کرو۔

اس زمانہ میں سابقہ ضلع اعظم گڈھ اور حالیہ ضلع مئو کی ایک بستی بھیرہ ولید پور میں سلسلۂ سہروردیہ کے مشائخ میں ایک بزرگ مولانا شاہ احسان اللہ صاحب فاروقی تھے، ان کے دورے دعوت وتبلیغ کے لئے ہوا کرتے تھے، شاہ صاحب بہت اچھے واعظ تھے، ان کے مواعظ بہت پُر تاثیر ہوا کرتے تھے، ساتھ ہی ساتھ صاحب نسبت بزرگ تھے، قلب کی نسبت اور زبان کی فصاحت وبلاغت نے انھیں سراپا تاثیر بنا دیا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے شاگرد مولانا محبوب علی علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے، نزہۃ الخواطر میں ہے:

كان آيةً ظاهرةً في الموعظة والتذكير هدى الله به سبحانه خلقاً كثيراً من عباده. (وعظ وتذکیر میں ایک واضح نشانی تھے، اللہ سبحانہ نے ان کے واسطے سے اپنے بہت سے بندوں کو ہدایت دی)

۱۳۰۰ھ میں انتقال ہوا۔ (ج:۷،ص:۲۵)

مولانا احسان اللہ صاحب سمرا مدرسے میں بھی تشریف لایا کرتے تھے، اور اسے مرکز بنا کر آس پاس تبلیغی دورے کیا کرتے تھے، ان کے مریدین بکثرت تھے، حضرت میاں صاحب انھیں سے بیعت ہوگئے، مگر اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ حضرت مولانا شاہ احسان اللہ صاحب بھیروی، بھیرہ ہی کے ایک بزرگ شاہ عبد

العلیم فاروقی کے خلیفہ تھے، وہ اپنے برادر بزرگ شاہ ابواسحٰق بھیروی کے اوروہ اپنے والدشاہ ابوالغوث گرم دیوان قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔ (۱)

حضرت شاہ احسان اللہ صاحب کی وفات کے بعد حضرت میاں صاحب بدرالملۃ حضرت محمد چاندشاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں ٹانڈہ حاضر ہوئے۔ چاندشاہ صاحب کے حالات گزشتہ صفحات میں گزر چکے ہیں، وہاں کچھ عرصہ تک رہ کر انھوں نے تعلیم روحانی مکمل کی اوراجازت وخلافت سے سرفراز ہوکر وطن تشریف لائے۔ اوراپنے مرشد کے حکم سے وہیں خلوت گزیں ہوگئے۔ علائق دنیوی سے بے نیاز یادمولی میں اورمجاہدہ وریاضت میں محویت کواپنا شعار بنایا۔ ٹھیک اپنے پیرومرشد کے رنگ میں قدم جما کر بیٹھ گئے توسوائے فریضۂ حج اورزیارت پیرومرشد یابعض شدید مجبوریوں کے کبھی باہرتشریف نہیں لے گئے، فقروقناعت کی دہلیز پردھونی رما کر بیٹھ گئے تواس کی آبرو بے داغ بچالے گئے، لیکن یہ خوشبو ایسی نہیں ہے، جسے بند کیا جاسکے آہستہ آہستہ بندگی وعبادت کی خوشبو پھوٹتی اورپھیلتی رہی، خدا کے طالب آتے رہے شیخ ومرشد کے حکم کے مطابق جوراہ مولی کا طالب آیا اس کی رہنمائی کی، اللہ کے نام سے جولذت حاصل کی تھی، اس سے دوسروں کوبھی شادکام کیا۔

۱۳۴۲ھ تک اپنے وطن مالوف نوتن ہریا میں مقیم رہ کر اللہ کے نام کی روشنی پھیلاتے رہے۔ ۱۳۴۲ھ میں یکا یک کوئی اشارۂ غیبی وارد ہوا۔ آپ نے وطن سے ہجرت کا

---

(۱) بھیرہ ولید پور کے جنوب اورمحمد آباد گہنہ سے شمال مغرب میں ٹونس ندی کے کنارے ایک گاؤں ہے جوعرصۂ قدیم سے مشائخ سلسلۂ سہروردیہ کا مسکن تھا۔ اسی خاندان کے بزرگ حضرت مولانا شاہ علی احمد صاحب بھیروی تھے۔ اب اس گاؤں میں اس خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں رہا، میرے بچپن میں بعض حضرات تھے، جواب پاکستان منتقل ہوگئے ہیں، حضرت مولانا محمد اسلم صاحب نوراللہ مرقدہٗ جوعرصۂ دراز تک جامعہ مخزن العلوم ولدارنگر غازی پور کے صدر مدرس رہے۔ اوراس علاقہ میں ان سے بہت ہدایت پھیلی، وہ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ گھوسی کے قریب اَملا میں منتقل ہوگئے تھے۔ خاکسار راقم الحروف کا آبائی وطن بھیرہ ہی ہے۔ (اعجاز احمد اعظمی)

قصد فرمایا، اعزاء واقرباء اصرار کرتے رہے، مگر آپ نے کسی کی بات پر توجہ نہ دی، یکہ پر بیٹھ کر اپنی بستی سے پورب جانب تشریف لے گئے، لوگ پوچھتے کہ حضرت کہاں کا قصد ہے؟ فرماتے جہاں اللہ پاک کو منظور ہو۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ''اندروا عباداللہ'' نامی ایک بستی ہے، وہاں کے لوگوں نے از راہ عقیدت مندی بہت اصرار کیا، تو آپ نے وہاں قیام فرمانا منظور فرمالیا۔ چنانچہ وہاں عقیدت مندوں نے ایک خانقاہ بنوادی، اور آپ تادم وصال وہیں تشریف فرما رہے۔

اندروا تشریف لانے کے دو چار دن کے بعد کچھ احباب نوتن کے اور کچھ احباب دوسرے مقامات کے حضور میں حاضر ہوئے، ان لوگوں کا تقاضا ہوا کہ پھر نوتن تشریف لے چلیئے، فرمایا کہ گائے بھینس کے تھن سے دودھ دوہ کر واپس کردو، جب میرا واپس جانا ممکن سمجھو، دیر تک خود آبدیدہ تھے اور اقرباء بھی روتے رہے۔ (خصائص نعمت، ص:۶)

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آپ کا یہ انتقال مکانی اپنے ارادہ سے نہ تھا، بلکہ کوئی اشارۂ غیبی تھا۔ اور آپ اس پر ثابت قدم رہے۔

اندروا میں بھی آپ اسی استقامت، فراغت قلب اور یکسوئی وقناعت کے ساتھ عبادت وریاضت ذکر وفکر تربیت سالکین اور تزکیۂ قلوب میں مصروف رہے۔ جو نوتن میں آپ کا شعار تھا۔ ۶/سال وہاں قیام رہا۔ ۱۳۴۸ھ میں حضور حق میں آپ حاضر ہو گئے۔ **رحمه الله ونور مرقدهٗ ويرد مضجعه وادخله الجنة برحمته وهو ارحم الراحمين.**

حضرت شاہ صاحب کے ارادت مندوں میں جید الاستعداد علماء کی ایک خاصی تعداد تھی، ان میں ایک صاحب علم اور صاحب قلم مولانا محمد جمیل صاحب انصاری مدرس عالیہ کلکتہ تھے، یہ بزرگ سیوان کے رہنے والے تھے، انھوں نے ''تاریخ ولی کامل'' کے نام سے حضرت کے حالات مختصراً لکھے ہیں، اسی کتاب کی مدد سے یہ مضمون مرتب کیا جا رہا ہے، اس

میں انھوں نے بتایا کہ:

اوصاف و اخلاق : امام غزالی، شیخ فرید الدین عطار، حافظ شیرازی، شیخ سعدی، مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری، مجدد الف ثانی وغیرہ صوفیا کرام رحمہم اللہ کی تصانیف برابر آپ کے مطالعہ میں رہا کرتی تھیں، ان کے مسائل و دقائق پر پورا پورا عبور تھا، اردو تصانیف میں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی کتابیں بڑی دلچسپی سے سنا کرتے تھے اور بیچ بیچ میں اسرار و معارف بیان کرتے تھے۔

آپ ذہن ثاقب ورائے صائب رکھتے تھے، ہر معاملہ کو خوب سمجھتے تھے، خود تارک الدنیا تھے قانع اور بے طمع تھے۔ لیکن دنیا داروں سے خواہ وہ وکلاء ہوں حکام ہوں، زمیندار ہوں مقدمہ باز ہوں، ملتے تھے، اور انھیں نصیحتوں سے نوازتے اور ان کے لئے دعاء خیر کرتے تھے، آپ کے دربار میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، جاہل عالم ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ اور حسن سلوک ہوتا۔ اخلاق محمدی کے مجسم نمونہ تھے، امراء و حکام آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ فرماتے، مگر تملق اور خوش آمد کی گفتگو کبھی نہ فرماتے، نہ ان کی تعظیم کے لئے کبھی کھڑے ہوتے، البتہ برادران طریقت خصوصاً مئو کے مشہور محدث حضرت مولانا عبدالغفار صاحبؒ تشریف لاتے تو آپ کھڑے ہوتے اور مصافحہ و معانقہ کرتے۔

امراء و روسا اور زمینداروں کے در پر نہیں جاتے تھے، اور نہ بستی سے باہر کبھی قدم رکھتے، اوپر گزر چکا ہے کہ بعض شدید ضرورتوں سے آپ باہر تشریف لے گئے ہیں، ورنہ ہمیشہ اپنی خانقاہ میں خلوت گزیں رہتے تھے۔ آپ دنیا داروں کے پاس خط لکھنے میں سبقت نہیں فرماتے تھے، اگر کوئی خط لکھتا خواہ دنیا دار ہو یا اہل علم و اہل فقر فوراً جواب دیتے جس کام کو شروع کرتے ادھورا نہ چھوڑتے، آئندہ کیلئے بات ان شاء اللہ کے بغیر نہ بولتے، تہذیب و ادب کا پورا لحاظ رکھتے، طریقۂ سنت پر قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے ہر موقع اور ہر مسئلہ میں

اپنے مرشد کا حوالہ دیتے کہ میں نے حضرت کو ایسا کرتے یا ایسے کہتے دیکھا یا سنا ہے۔

کوئی سنت حتی الوسع ترک نہیں فرماتے، ہر کام میں بسم اللہ کرتے، کچے مکانوں سے بہت خوش ہوتے، پختہ مکان سے الفت نہ تھی، بعض ارادت مندوں نے نوتن میں آپ کے لئے پختہ مکان تعمیر کر دیا تھا، مگر آپ کا قیام کچے ہی مکان میں رہا، مہمانوں کو پختہ مکان میں ٹھہراتے۔

تمام شب عبادت و ریاضت میں گزارتے، پیرانہ سالی میں بھی وہی طریقۂ و معمول رہا۔ جو جوانی میں تھا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ذکر قلبی سے کبھی غافل نہ ہوتے، اور زبان سے بھی اللہ اللہ برابر کرتے، اور صبح و شام اذکار مسنونہ کے پابند رہا کرتے۔

ارادت مندوں کو برابر نماز روزہ اور دیگر عبادات کی تعلیم و تلقین فرماتے، چنانچہ حضرت شاہ صاحب کی یہ کرامت مشہور ہے کہ جس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، اور بیعت کر لی وہ کبھی تارک صوم وصلوٰۃ نہیں ہوا۔

تسلیم و رضا کا یہ حال تھا کہ جو کچھ کھانے کو مل جاتا کھا لیتے، جو کچھ پہننے کو مل جاتا پہن لیتے، کسی چیز میں کوئی تکلف نہ تھا۔

حضرت شاہ صاحب کے صاحبزادے مولانا شاہ حفظ الرحمٰن صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ”ایک بار نوتن میں چند اعزہ تشریف لائے، اتفاق سے نہ کوئی ترکاری ہی تھی نہ گوشت مچھلی کا نظم تھا، میں نے کہا کہ ابا ایک روپیہ عنایت فرماتے تو ایک مرغ پاس کی بستیوں سے تلاش کرا کے منگوا لیتے، اس کے جواب میں فرمایا فقیر کو تکلفات سے کیا نسبت، اگر بازار ہوتا، تو کوئی ترکاری منگا لیتے فرض کرو اگر آج ایک روپیہ ہو تو مرغ منگا لو، اور کل اگر کچھ نہ ہو تو پھر کسی عزیز کی مدارات میں کیا خرچ کرو گے، جس طرح یہ لوگ میرے مہمان ہیں، اسی طرح میں بھی تو پروردگار عالم کا مہمان ہوں، قاعدہ یہ ہے

> کہ جلیل القدر میزبان مہمان کے متعلقات کے ساتھ بھی مہمانی کا حق ادا کرتا ہے۔ ان تر ددات کو اللہ ہی کے سپرد کرو۔‘‘

حضرت شاہ صاحب نے اس ارشاد سے تمام تکلفات کو برطرف کر دیا، مگر جلیل القدر میزبان کی دلداری ملاحظہ ہو، وہ کس کس طرح اپنے اوپر اعتماد و توکل کرنے والوں کو نوازتے ہیں۔ آگے صاحبزادے محترم لکھتے ہیں:

> ’’اس فرمان کے دو گھنٹے کے بعد ایک شخص کہیں سے پلاؤ ایک دیگ اور گوشت ایک دیگ لے کر آیا، خوب شوق سے احباب نے کھایا، صبح کو ضلع گورکھپور سے ایک شخص ایک روہو مچھلی دو پسیری وزن کی لایا، پھر سب نے نہایت ذوق و شوق سے کھایا۔
> (خصائص نعمت۔ ص)

عملیات (۱)، دعوات اور کیمیا وغیرہ سے سخت نفرت تھی، آپ سماع نہ سنتے تھے اور نہ میلاد و عرس میں شرکت فرماتے۔

جو کچھ فتوحات ملتی اس کو عزت اور خوشی سے قبول کرتے اور لانے والے کو خوب خوب دعائیں دیتے، ایک مرتبہ ایک صاحب بہنگی پر کچھ ساگ ترکاریاں لدوا لائے، آپ بہت خوش ہوئے، خوب دعائیں دیں، فرمایا کہ میرا بھی دل چاہتا تھا آخر اللہ میاں نے بھیج ہی دیا۔ شکر ہے اس پروردگار عالم کا۔

اس خوشی سے قبول کرنے اور اس عزت سے لینے کی وجہ یہ ہے کہ نذر دینے والا ایک وسیلہ ہے، دراصل بھیجنے والا اللہ پاک ہے۔ اور خدا کی بھیجی ہوئی چیز کو ضرور عزت و خوشی سے قبول کرنا چاہئے۔

آپ کسی کی غیبت نہ سنتے، اگر ناواقفی سے کوئی غیبت کر بیٹھتا، تو آپ اس کو تنبیہ کر دیتے، اور محمل صحیح پر محمول کرتے، اور اس کی بری بات کی اچھی تاویل کر دیتے کہ بھیا اس

---

(۱) عملیات وہ ہیں جن سے جنات (موکل) تابع ہوں، اور دعوات عاملوں کی اصطلاح میں ان منتروں اور دعاؤں کو کہتے ہیں جو جادو کا کام کریں۔

نے شاید اس وجہ سے یہ کام کیا ہو۔ آپ کسی کے ساتھ گمان بد نہ رکھتے، کیونکہ خدا نے گمان بد سے منع کیا ہے۔

رات کو سوتے وقت بلا ناغہ مسنون طریقہ پر سرمہ استعمال فرماتے، آپ کا چہرہ نہایت نورانی اور باوقار تھا، بایں ہمہ خندہ پیشانی سے ملتے تھے، ہنسی مذاق کی باتیں کبھی نہ کرتے تھے البتہ مسنون طریقہ پر لطیف پیرایہ میں کبھی کبھی مزاح فرماتے تھے، مگر بہت کم اللہ تعالیٰ نے آپ کو کمال درجہ کا زہد و توکل، ورع و تقوی، قناعت و استغناء، مروت و سخاوت مجاہدہ و ریاضت، اتباع سنت، اخلاق حسنہ، غیرت و شجاعت وغیرہ عطا فرمایا تھا، ان فضائل و کمالات میں آپ پیر و مرشد علیہ الرحمہ کے قدم بقدم تھے۔

آپ غرباء مساکین پر بیحد مہربان رہتے، بیچاروں عاجزوں کی خبر گیری فرماتے، یتیموں اور بے کسوں پر شفقت رکھتے، سائل کو کبھی محروم نہیں جانے دیتے، یہاں تک کہ بعض لوگ آپ کو برا بھی کہتے، مگر آپ برابر ان کے ساتھ حسن سلوک ہی سے پیش آتے۔

آسائش کے سارے سامان حضرت کے پاس بلا طلب موجود رہتے مگر آپ فقیرانہ ہی زندگی بسر کرتے، اور جو کچھ از قسم فتوحات آپ کی خدمت میں پہونچتا۔ آپ مہمانوں پر خرچ کر دیا کرتے۔ کبھی کسی مہمان کو مرید ہو یا غیر مرید بغیر کھائے جانے نہیں دیتے۔ اکثر دو دو چار چار روز بلکہ ایک ماہ دو ماہ بھی ٹھہر جاتے، سب کی خاطر برابر کرتے سب کی ضروریات کا خیال رکھتے، جو حقہ پیتا اس کے لئے حقہ جو پان کھاتا اس کے لئے پان، جو چائے پیتا اس کے لئے چائے کا انتظام کرتے، غرض جو کچھ آتا سب کچھ مہمانوں کے لئے تھا آپ نے کبھی مال و دولت کو جمع نہیں کیا، روزانہ اس دور میں بیس پچیس روپے فتوحات میں آجاتے۔ مگر آپ نے جمع کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ کی اور نہ کوئی جائداد خریدی۔

خود تو کہیں تشریف نہ لے جاتے، اپنے صاحبزادوں کو بھی مریدوں کے گھر جانے نہیں دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ یہ رسمی پیرزادوں کا شیوہ ہے، ریا و حب جاہ سے نفرت

تھی، کسی قسم کی شان آپ کی نہ تھی، باہر سے ناواقف آنے والوں کو دقت سے تمیز ہوتی تھی کہ اس میں پیر کون ہے۔

آپ صبح کی نماز کے بعد ایک دو گھنٹہ تک خود بھی مراقبہ میں بیٹھتے تھے، اور مریدوں کو بھی حلقہ میں بیٹھاتے تھے، اور فرمایا کرتے کہ صبح کے مراقبہ میں ہمارے یہاں کچھ تقسیم ہوتا ہے، جو خوش نصیب ہیں، وہ اپنا اپنا حصہ لے لیتے ہیں۔ وقوف قلبی کی مریدوں کو سخت تاکید تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دم بھی دل کو بیکار نہ چھوڑے ہمیشہ اس پر دھیان رکھے کہ یاد خدا سے غافل نہ ہونے پائے۔

خرق عادت اور اظہار کرامت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، اگر احیاناً اضطراری حالت میں کوئی بات ظاہر ہو جاتی۔ تو اس کے اخفاء کی کوشش کرتے، یا کوئی تاویل فرماتے، اور کبھی معتقدوں کے کہنے پر ہنس کر رہ جاتے اور فرماتے ہاں اپنا اپنا اعتقاد ہے۔

آپ میں تکلف، تصنع اور بناوٹ بالکل نہ تھی، جو بات تھی بے تکلف تھی، جو کام تھا بے تصنع تھا، اپنا کام خود کرلیا کرتے تھے، مریدوں کے ساتھ ان کے کاموں میں شریک ہو جاتے، اکثر مہمانوں کے ساتھ دسترخوان پر کھانا تناول فرماتے، مٹی کے برتن آپ کو مرغوب تھے، کبھی کبھی فرماتے کہ کنویں سے پانی نکالنا، کھیتی باڑی کرنا، سب ہم اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، کسی کے محتاج نہ تھے، اب بڑھاپے نے محتاج کر دیا ہے، آپ بخلاف اور درویشوں کے لوگوں سے دنیا کی باتیں بھی کرتے تھے، اس میں بظاہر مصلحت یہ تھی کہ مہمانوں کی دلجوئی ہو، اور دنیاوی اغراض والے بدعقیدہ ہو کر کنارہ کش ہو جائیں، اس لئے کہ دنیاداروں کی صحبت سے اہل اللہ بہت گھبراتے ہیں، آپ میں یہ عجیب بات تھی بظاہر باخلق و بباطن باحق، دل بیار و دست بکار، کسی خوشی اور غم کا آپ پر اثر نہ ہوتا۔ آپ فرماتے تھے

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیش ہمت ما ہر چہ آمد بود مہمانے

نہ خوشی نے کوئی سامان دیا، نہ غم کوئی نقصان لایا۔ ہمارا حوصلہ ایسا ہے کہ جو کچھ اس کے سامنے آیا، وہ مہمان ہی رہا۔

آپ فرماتے تھے کہ فقیر تو پہلے ہی مر چکا ہے، اب مرنے کا ڈر نہیں ہے، جب موت آئے تیار بیٹھے ہیں ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

پنجگانہ نماز جماعت سے اول وقت پر مسجد میں ادا فرماتے، خود امام نہیں ہوتے کسی عالم یا حافظ کو امام بناتے، روزانہ صبح کو مراقبہ اور نماز اشراق سے فارغ ہو کر قرآن شریف کی تلاوت فرماتے، ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو حضرت پیر و مرشد نے ایک پارہ روز آنہ تلاوت کرنے کا حکم دیا، جس کو میں بحمد اللہ روزانہ بلا ناغہ پورا کرتا ہوں۔

وضو میں اذکار مسنونہ پڑھتے، نیز جمعہ کو حجامت بنواتے، الغرض افعال، اقوال رفتار گفتار، ہر امر میں شریعت اور اقتداء سنت ملحوظ خاطر عاطر تھی۔

حضرت شاہ صاحب کی قوت کشفیہ بھی ان کے پیر و مرشد حضرت چاند شاہ صاحب کی طرح بہت بڑھی ہوئی تھی۔ مولانا محمد جمیل صاحب فرماتے ہیں کہ:

> ’’آپ پر کشف کا عالم ہمیشہ رہتا، مگر آپ کبھی مغلوب نہ ہوئے، بہت ضبط سے کام لیتے، بعض اوقات اظہار فرما دیتے، ایک مرتبہ کا واقعہ میں آپ بیتی عرض کرتا ہوں کہ جمعہ کی نماز کے بعد حضرت کی خدمت میں ایک خاص مدعا لے کر حاضر ہوا۔ میں نے صرف اتنا ہی عرض کیا تھا کہ حضور دعا فرمائیں۔ آپ نے کشف سے دریافت فرما کر اس حاجت کا ذکر کرتے ہوئے چند باتیں تسلّی و تشفی کی فرمائیں۔ اور ارشاد فرمایا ابھی ایک سال صبر کرو ایک سال کے بعد میرا وہ مدعا حسب دلخواہ پورا ہو گیا۔ **الحمد للہ علیٰ احسانہٖ.**

مولانا ابوالہاشم سید محمد شافق صاحب برونوی حضرت کے حین حیات اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ مجھے ترمذی شریف کے ایک مقام پر سخت اشکال اور پریشان کن شبہات پیش آئے دوسرے دن سبق پڑھانا تھا، رات کو میں سو گیا، حضرت کو خواب میں دیکھا آپ فرماتے ہیں کہ متن پڑھو میں نے متن پڑھ کر سنایا، آپ نے تمام اشکالات و شبہات حل کر دئے باوجودیکہ حضرت نے علوم رسمیہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

تصانیف : حضرت شاہ صاحب باقاعدہ صاحب تصنیف تو نہ تھے، لیکن سالکین وذاکرین کے لئے چند مختصر مختصر رسالے کچھ نثر میں اور کچھ نظم میں مرتب فرمائے ہیں، ان سب کا مجموعہ حضرت مولانا محمد جمیل صاحب علیہ الرحمہ نے ’’کلیات نعمت‘‘ کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ رسالے حسب ذیل ہیں۔ ایک رسالہ ’’مرحمت نامۂ نعمت‘‘ جو شجروں پر مشتمل ہے الگ سے بھی شائع ہوا ہے، (۱) نجات آخرت، (۲) انوار القلوب، (۳) مثنوی باری، (۴) مکتوبات نعمت، (۵) تنبیہ نفس امارہ (منظوم)، (۶) کشکول نعمت، (۷) نصیحت نامہ (منظوم)، (۸) مکاتیب منظومہ، (۹) مجربات نعمت، (۱۰) مناجات (منظوم)، (۱۱) بارہ ماسہ

ملفوظات : حضرت شاہ صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے صاحب نسبت اور صاحب معرفت بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں وہ خاص جوہر اور ملکہ حاصل تھا جسے خلاصۂ علم کہئے، ان کے حلقۂ ارادت میں بڑے بڑے علماء شامل تھے، اور ہر ایک ان سے اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق فوائد حاصل کرتا تھا۔ ان کے وصال کے بعد ان کے متوسلین نے چاہا کہ قدرے ان کے ملفوظات جمع ہو جائیں تاکہ انھیں سے گونہ تسلی و تعلیم حاصل ہوتی رہے۔ حضرت کے صاحبزادے اور جانشین شاہ حفظ الرحمٰن صاحب نے کچھ ملفوظات جمع کئے، کچھ مولانا محمد جمیل صاحب نے، اور اس کی درخواست حضرت شاہ صاحب کے بڑے خلیفہ اور صاحب نظر عالم مولانا ریاض احمد صاحب چمپارنی

علیہ الرحمہ سے کی گئی۔ تو انھوں نے ایک مکتوب کے ضمن میں بعض ملفوظات لکھ کر بھیجے، ان سب کا مجموعہ حضرت مولانا محمد جمیل صاحب نے ''خصائص نعمت'' کے نام سے شائع کیا۔ اس مجموعہ سے چند ارشادات نقل کئے جاتے ہیں۔

''حضرت مولانا ریاض احمد صاحب نے اپنے مکتوب کی تمہید میں فرمایا ہے کہ:

> ''ملفوظات شریفہ'' کے عنوان کے تحت لکھنے کے لئے میری روایت وسند سے کوئی صحیح واقعہ بطور روایت باللفظ نہیں مل سکتا، اس لئے کہ مجھے اپنے حافظہ پر ہرگز اعتماد نہیں ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ عرصہ تیس بتیس سال کی مدت تک مجھے شرف صحبت حاصل ہوا، گاہ بگاہ مسلسل کتنے ایام خدمت میں رہا، لیکن نہ تو حضرت والا کو اس کی طرف توجہ تھی، اور نہ مجھ کو اس کا خیال ہوا۔ مجھے جو کچھ عمل کے لئے فرمایا، میں نے اس پر حتی الامکان عمل کیا، حضور اقدس کی تعلیم کا ادنی اثر یہ تھا کہ جمیع ماسوا کا تخیل قلب سے محو ہو جاتا تھا، جس نقطۂ وجود پر استقرار کا ارشاد ہوتا تھا وہی سامنے رہتا تھا۔ اور بس، وعظ ونصائح کے سلسلے میں جو کچھ فرماتے تھے، وہ جستہ جستہ احادیث شریف کے تراجم کے جواہر ریزے ہوتے تھے، یا وہ باتیں تھیں جو اعلیٰ حضرت شیخ الشیوخ حضرت چاند شاہؒ سے سنی تھی۔ (خصائص نعمت ص ۱۱)

فرمایا کہ جانتے ہو تصوف کسے کہتے ہیں؟ تصوف کہتے ہیں، عقل کا راست ہو جانا فرماتے تھے کہ طالب راہ کے لئے انوار واشباح سدراہ ہیں۔ مرد وہ ہے، جو ان کی طرف دھیان نہ دے اگر روشنی کوئی چیز قابل طلب ہوتی، تو دنیا میں سب سے روشن آفتاب ہے، مگر اس کی پرستش کفر وشرک ہے۔

فرماتے تھے کہ ریا شرک خفی ہے، یہ ایسا روگ ہے کہ سب سے آخر میں اس کے نکالنے پر قدرت ہوتی ہے۔ فرماتے تھے کہ وقوف قلبی کسی وقت ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے، قلب کا دروازہ اسی کنجی سے کھلتا ہے، فرمایا سب طریقوں سے اسلم طریقہ دل بیار

دوست بکار'' کا طریقہ ہے۔ ظاہر میں متشرع بنے رہو، دل سے درویش صاحب باطن۔

فرمایا: ادنی درجہ کی سنت میں وہ نور و ثواب ہے۔ جو ہزاروں برس کی ریاضت و مجاہدۂ بدعت میں نہیں ہے۔

فرمایا: ایک بار ہم اور مولانا عبداللہ شاہ صاحب (اہرولی) دونوں ٹانڈہ گئے تھے، جب حضرت سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے، تو حضرت نے دعا فرمائی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلا تشبیہ خدائے تعالیٰ بلا حجاب سامنے موجود ہے، دعا کی کہ ''اے خدا ان دونوں کو صدیق کر دے'' فرماتے تھے کہ حضرت کی دعا برکت ہے، جو کچھ ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت! بہت سے بزرگان دین نے بہت سی باتیں ایسی ایسی کہہ دی ہیں، جن کے متعلق حضور اخفا فرماتے ہیں، فرمایا جانے دو، مجھے گم نام ہی رہنے دو میں مجبور ہوں، اس لئے کہ میرے لب پر حضرت اعلیٰ (چاند شاہ صاحب) نے مہر لگادی ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

نماز تہجد و شب بیداری کی شدید تاکید فرماتے تھے، ایک مرتبہ حکیم رفیع اللہ صاحب نوتن میں تہجد کے وقت حضرت آسی کے اشعار پڑھنے لگے، حضرت اندر تشریف فرما تھے، جب نماز کے لئے باہر تشریف لائے تو فرمایا کہ یہ وقت شعر خوانی کا نہیں ہے، یہ وقت خیالات کے سمیٹنے کا ہے، ہر چہار طرف سے پریشانیوں کو دور کر کے ایک نقطہ پر قلب کو لانا چاہئے، یہ کیا بے وقت کی راگ ہے۔

فرمایا: بندگی و عبادت کی روح اخلاص ہے، اخلاص کے ساتھ تھوڑی سی عبادت بہت ثمرہ رکھتی ہے۔

فرمایا: اعتماد باللہ اور توکل علی اللہ ایسا ہونا چاہئے کہ اگر کسی سال ایک دانہ غلہ بھی نہ پیدا ہو، اور ساری مخلوق کی خوراک رسانی اسی کے ذمہ فرض ہو، تو بھی اس کا چہرہ متغیر نہ ہو۔

فرمایا: کہ ابتداء سلوک میں نوکری، کتاب بینی زن وشو کے تعلقات سب چھوڑنا چاہئے، ورنہ کامیابی مشکل ہے۔

فرمایا: کہ مخلوق کی نفع رسانی بہت بڑی قربت کی چیز ہے، محبوبیت کا درجہ اسی سے حاصل ہوتا ہے طالب کو کوشش کرنی چاہیئے کہ کسی طرح اس کی ذات سے خلائق کو نفع ہو، جس سے اس کی مقصد بر آری ہو۔

فرمایا: کہ وعظ میں توحید کی خوبی، شرک و بدعت کی برائی بیان کرنی چاہیئے جو ایسا کرتا ہے وہی عالم وارث الانبیاء ہوتا ہے۔

فرمایا: کہ امراء رؤوسا سے ملنے میں اگر مداہنت و سستی دین میں پیدا ہونے کا خوف ہو تو اس سے دور بھاگنا چاہیئے، فقیر کو حشمت و جاہ سے کیا عرض، فقیر اکیلا ہوتا ہے، اور حقیقت میں اکیلا نہیں۔

یہ ملفوظات حضرت مولانا ریاض احمد صاحب علیہ الرحمہ کے جمع کردہ ارشادات سے انتخاب ہیں، آخر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ’’تیسری بات جو عرض کرنی ہے، وہ حضرت کے خصوصی امتیاز وصفات کا بہم پہونچانا ہے، اس دور میں بہت سے اکابر دین گزرے، کوئی علوم شریعت کا ماہر تھا، کسی پر عشق وفنائیت کا غلبہ، کسی سے خرق عادات کا صدور پیہم ہوتا تھا، لیکن ایسی پاکیزہ زندگی جو صحیح معنی میں حیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حیات صحابہ کی مثال اور اسوۂ حسنہ پیش کرتی ہو، وہ اعلیٰ حضرت کی پاک زندگی تھی، تکلف و تصنع، ریا و نمائش کا شائبہ تک بھی نہ تھا، عبادات میں شریعت کی پیروی ہر لمحہ منظور نظر رہتی تھی، معاملات شریعت کے دائرہ سے ہٹنے نہیں پاتے تھے، مزاج میں نہ تشدد تھا، نہ سستی و مداہنت، اخلاق گویا اللہ تعالیٰ نے کامل سے کامل عطا فرمایا تھا۔ مہمان نوازی، غریب پروری، سخاوت و استغناء اور توکل کے جوہر حاصل تھے، حضرت کی مجلس خلوص و مساوات اور یاد خدا کے لحاظ سے مجلس رسول صلی اللہ علیہ وسلم معلوم ہوتی ہے، اذکار و اشغال کی تعلیم حسب حوصلۂ مریدین فرماتے تھے، لیکن سب سے بڑی تاکید اور بڑا زور ’’وقوف قلبی‘‘ پر تھا۔

> عشق ومحبت کی لفظی تعلیم نہیں ہوتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عشق ومحبت کا راز اور کنہ ایک صحبت میں جھلکنے لگتا تھا، دنیا سے نفرت، خدا اور رسول سے محبت، عبادت میں ذوق وشوق اور حلاوت پیدا ہو جاتی تھی، خدا ورسول کے عشق ومحبت کی لگن دل میں لگ جاتی تھی۔

آپ نے بار بار ارشاد فرمایا کہ اس بات کی کوشش وسعی ضروری ہے کہ سنت سرکار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کامل طور پر حاصل ہو، اور بدعت سے کنارہ کشی واجتناب بدرجۂ اتم ہو جائے، خاص کر اس بدعت سے جو رافع سنت ہو، اجتناب واحتراز لازمی ہے۔

ایک بار آپ نے چند حاضرین مجلس کے سامنے فرمایا کہ قلب پر ہمیشہ دھیان رہنا چاہئے، قلب کے احوال سے کبھی غفلت نہ برتی جائے، قلب کے ذاکر ہونے سے تمام لطائف خود بخود ذاکر ہو جاتے ہیں۔

حضرت مولانا حافظ حاجی عبدالغفار صاحب مئوی کا جب ذکر فرماتے تو بڑے اہتمام سے ذکر فرماتے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وہ بڑے محقق عالم تھے۔

حضرت چاند شاہ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ اکثر فرمایا کرتے۔ فرماتے کہ آپ علم وعمل کے جامع تھے، ایسے لوگ اب کہاں، حضرت مولانا محمد احسان اللہ صاحب بھیروی کا بھی ذکر خیراً کثر کرتے، شاہ ولی اللہ محدث، شاہ عبدالعزیز محدث، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحق مہاجر مکی کا ذکر خیرا کثر کرتے سنا۔

تحفۂ اہل حدیث نامی رسالہ ایک غیر مقلد صاحب نے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ آپ نے سرسری نظر سے ملاحظہ فرما کر بحفاظت رکھوا دیا، اور فرمایا سوائے علماء محققین کے دوسرے کو نہیں دیکھنا چاہئے کہ گمراہی کا قوی اندیشہ ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب خاکسار خدمت اقدس میں حاضر ہوا (مولانا محمد جمیل صاحب علیہ الرحمہ) تو وہ کتاب آپ نے عطا فرمائی، اور فرمایا کہ آپ جیسے محقق عالموں کے سوا دوسروں کو یہ کتاب دیکھنا مناسب نہیں ہے،

ورنہ عام لوگ گمراہ ہوجائیں گے، اس موقع پر مولانا عبدالغفار صاحب مئوی کا بھی ذکر فرمایا کہ غیر مقلدین کا خوب رد کرتے تھے۔

اکثر فرماتے کہ علمائے سلف کے مسائل وتحقیقات پر عمل کرنا چاہئے، آج کل کے مولویوں نے جب جاہ اور دنیا طلبی میں پھنس کر اکثر مسائل میں گڈ مڈ کر دیا ہے۔

ایک بار آپ کی مجلس شریف میں ایک صاحب کا ذکر آیا کہ ان کے تعویذات بہت موثر ہوتے ہیں آپ نے فرمایا ہاں، مگر تعویذات وعملیات سے حتی الامکان احتراز کرنا چاہئے، جو تعویذات کہ سلف سے منقول اور پیران عظام سے ماثور ہیں، ان کے علاوہ دوسرے عملیات کرنے میں اندیشہ ہے۔

یہ ارشادات، حضرت مولانا محمد جمیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جمع کردہ ملفوظات سے منتخب کئے گئے ہیں۔

اب چند ارشادات حضرت صاحبزادۂ محترم کے جمع کردہ حصے سے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ایک حافظ صاحب جو حضرت شاہ صاحب کے رشتہ دار بھی تھے، اور آپ سے بے تکلف بھی تھے، انھوں نے ایک بڑے مجمع کی موجودگی میں عرض کیا کہ شاہ صاحب! ایک بات دریافت کرنی ہے بشرطیکہ گستاخی معاف کریں اور جی کھول کر بتائیں تو عرض کروں، والد صاحب مرحوم فرمایا کہ بے ادبی کیا ہے؟ کسی بات کے دریافت کرنے سے انسان بے ادب نہیں ہوتا اور ہم تم تو ہم سن ہیں۔ بلکہ مجھ پر تمہیں فضیلت ہے کہ حافظ کلام اللہ ہو، انھوں نے جواب دیا کہ آپ ولی اللہ ہیں، حضرت نے فرمایا کہ کیا حافظ کلام اللہ ولی اللہ نہیں ہوتا، اس پر حافظ صاحب خاموش ہوگئے، پھر چند منٹ کے بعد کہا کہ شاہ صاحب! ہم یہی پوچھتے ہیں کہ آپ کیوں اس قدر بخیل ہوگئے ہیں کہ زندگی میں آپ نے کسی کو اپنا نمونہ نہیں بنایا۔ خیال فرمائیے کہ ایک آپ کے پیر بھی تھے کہ جن کے اٹھارہ خلفاء تھے، اور ایک آپ ہیں کہ

اپنی ولایت ودرویشی اپنے ہمراہ قبر میں لے جائیں گے۔ اب سے بھی اپنی یادگار اور اپنا سچا جانشین چھوڑ جایئے۔

فرمایا کہ اے بھائی! وہ آسمان ولایت کے آفتاب اور چرخ قطبیت کے ماہتاب تھے اور میں ایک ذرۂ ناچیز ہوں، تو پھر ذرہ کی کیا حقیقت ہے کہ آفتاب کا مقابلہ کرے۔

پھر حافظ صاحب نے کہا کہ آپ اپنی جگہ ویران کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا کہ میرے اختیار میں کیا ہے۔ میں ایک نکما آدمی ہوں، اللہ اللہ کرتا ہوں اور میں کیا جانتا ہوں، اگر اس کو منظور ہوگا ویران ہی کرنا، تو کوئی کیا کرسکتا ہے یا یہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص میرے ہی جیسا نکما ہو اس کو اللہ تعالیٰ میری جگہ پر رکھ دے۔

مولف کہتا ہے (مولانا محمد جمیل صاحب) کہ اس سے حضرت کے عجز وانکسار اور تواضع کا پورا ثبوت ملتا ہے، اور تسلیم ورضا کا بھی پورا پورا پتہ چلتا ہے۔

حافظ ولی محمد صاحب کے بڑے بھائی میاں یوسف صاحب حضرت والد صاحب سے ملنے آئے۔ والد صاحب نے ازخود اس قسم کا تذکرہ چھیڑا کہ اللہ تعالیٰ لڑکیوں کی شادی اور تعمیر مسجد سے سبکدوش کردیتا، تو سفر حج کے لئے میں تیار ہوجاتا، اور حج بیت اللہ سے اللہ تعالیٰ فارغ کراکے مدینہ منورہ پہونچادیتا، تو حبیب کبریا، سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ کی تازندگی خاکروبی کرتا، اور پھر وہیں کسی جگہ پیوند خاک ہوجاتا۔

اس پر بھائی یوسف صاحب نے کہا کہ حضرت میاں سے دریافت کرو جب ایسا ہی عزم ہے، تو آپ کا جانشین کون رہے گا۔ اس کا جواب یوں دیا کہ خلقت فانی ہے، جو باقی ہے وہی ہمیشہ رہے گا، اور اس کے سپرد میرا کل کام ہے۔

ایک بار کسی شخص نے کہا کہ اے حضرت! میری جانب عنان توجہ منعطف نہیں فرماتے۔ یا میں ایسا بدباطن ہوگیا ہوں کہ عنایتِ شیخ سے مستفیض نہیں ہوتا ہوں۔ کیا کروں، حضرت نے فرمایا بابا! ہر کام میں استقلالی زندگی درکار ہے سائل غالباً پڑھے لکھے آدمی تھے ان سے

دریافت فرمایا کہ فارسی عربی جو کچھ آپ نے پڑھی ہے، اس کی تحصیل کتنی مدت میں ہوئی انھوں نے کہا حضور دس سال سے کچھ زیادہ ہی دن ہوئے ہوں گے۔ اور یادالٰہی میں کتنے سال کا وقفہ ہوا؟ انھوں نے کہا حضور دو چار ماہ ہوئے ہوں گے، وہ بھی غیر استقلالی طور پر۔

فرمایا کہ علوم ظاہر سے علم باطن کی اہمیت آپ کی نگاہوں میں کم ہے، اس راہ میں تو اور خون جگر کھانا پینا پڑتا ہے، اور فرمایا کہ اولیاء اللہ کے سوانح حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدت مدید تک طالبان صادق نے صوفیائے کرام اور رہبران کامل کی خدمت میں زندگی بسر کی ریاضات شاقہ کے متحمل ہوئے، حب یادالٰہی وشراب محبت کے لذائذ سے محظوظ ہوئے اور رفتہ رفتہ محرم اسرار فنا وبقا ہوئے۔

اور ایک تمثیل بیان فرمائی کہ دودھ جوش کرکے اس میں ضامن (جورن) دے دو اور اسے ہلانا شروع کردو تو کیا جمنے کی جو کیفیت ہے، اس دودھ میں پیدا ہوسکتی ہے، اور اس کو دہی کہہ سکتے ہیں، پھر جب مزیدار دہی کھانا چاہتے ہو، تو دودھ کے برتن کو حرکات سے محفوظ رکھو اور فرمایا کرتے تھے کہ ؎

ثباتے بدست آورا ے بے ثبات
کہ برسنگ گرداں نروید نبات

اے غیر مستقل مزاج آدمی! استقلال پیدا کرو۔ دیکھو گھومنے والے پتھر پر کوئی چیز پیدا نہیں ہوسکتی۔

(فائدہ) اس سے معلوم ہوا کہ سالک جب استقلال کے ساتھ ذکر الٰہی میں لگا رہے گا، تو رسوخ پیدا ہوگا۔ ورنہ انتشار کی حالت میں ذکر کے رسوخ کی کوئی صورت نہیں۔

وفات : حضرت شاہ صاحب کے صاحبزادے محترم مولانا محمد ثابت الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ چند روزوں سے (حضرت) درد اعضاء میں مبتلاء تھے، غالباً زکامی شکایت تھی، درد سے اور کراہنے سے قیاس ہوتا تھا کہ حسب عادت مستمرہ طبیعت ناساز ہے، دفعۃً ۱۰/ جمادی الثانیہ (۱۳۴۸ھ) روز چہار شنبہ کو حالت خطرناک معلوم ہونے لگی۔

میں حکیم عنایت کریم صاحب کے بلانے کو سیوان چلا گیا، ایک شخص حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے بلانے کیلئے اہرولی بھیجا گیا، گیارہ بجے رات تک میں مع حکیم صاحب سیوان سے واپس آیا، مولانا بھی تشریف لائے، حکیم صاحب کے علاج سے فی الجملہ افاقہ ہوا، ٹھیک دو بجے حضور نے فرمایا کہ اب میں سوتا ہوں، ذکر وتہلیل ہمیشہ کی طرح زبان پر اور ضرب سری قلب میں جاری تھے، قلب کی حرکت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ آس پاس کے بیٹھنے والے صاف محسوس کرتے تھے کہ قلب ذاکر ہے، اور اللہ اللہ کرتا ہے، چند منٹ یہ کیفیت رہی، بس ایک آخری سانس کے ساتھ اللہ اللہ کہتے ہوتے واصل باللہ ہوگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

جنازہ میں چھ سات ہزار آدمی تھے، چار بجے اس زندۂ جاوید آفتاب عالم تاب اعلیٰ حضرت میاں صاحب قبلہ رضی اللہ عنہ کو صحن مسجد کے شمالی حصہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ کل **من علیھا فان ویبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام۔**

وفات کے قریب حضرت چادر تان کر لیٹے ہوئے تھے، مولانا عبداللہ شاہ صاحب اور حافظ صاحب (صاحبزادۂ محترم) وغیرہ تیمارداروں کے دل میں گزرا کہ اگر آپ کا وصال ہوگیا تو کہاں دفن کریں گے، یہ خطرہ ان صاحبوں کے دل میں گزرنا تھا کہ آپ نے چادر منہ سے ہٹائی اور فرمایا کہ مسجد کے شمالی گوشہ میں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور قبر مبارک آپ کی خام رکھی گئی۔

حضرت برابر فرماتے تھے کہ قبروں کا پختہ کرنا، گنبد بنانا یہ سب خلاف سنت ہے، مشائخ وسلاطین نے تحفظ وغیرہ کی مصلحت سے اختیار فرمایا ہے، مگر اتباع سنت اولیٰ واحق ہے۔ والحق أحق أن يتبع

شاعری وتصنیفات: حضرت میاں صاحب گو کہ عرف عام کے لحاظ سے شاعر نہ تھے، مگر طبیعت موزوں پائی تھی، کبھی کبھی نصیحت کے، یا طریقت کے اشعار کہہ لیتے تھے، اور اچھا کہتے تھے، تخلص کے طور پر کبھی نعمتؔ کبھی ہادیؔ کا لفظ استعمال فرماتے تھے،

مثنوی ہادی، تنبیہ نفس امارہ، مناجات، مکتوبات منظومہ آپ کے طبع وقاد کے نمونہ ہیں۔

حضرت میاں صاحب نے سالکین و مریدین کی تربیت و اصلاح کے لئے خود کو وقف کررکھا تھا، اس میں تصنیف و تالیف کی فرصت کہاں؟ لیکن طالبین ہی کے نفع کے لئے آپ نے چند رسائل نثر و نظم میں مرتب فرمائے تھے، جنھیں مولانا محمد جمیل صاحب سیوانی (خلیفہ حضرت) نے یکجا ایک جلد میں کلیات نعمت کے نام سے شائع کیا تھا، اب وہ بھی نایاب ہے، کلیات نعمت میں حسب ذیل رسائل ہیں۔

(۱) نجات آخرت
(۲) انوار القلوب
(۳) مکتوباب نعمت
(۴) مثنوی ہادی
(۵) تنبیہ نفس امارہ
(۶) مناجات
(۷) بارہ ماسہ
(۸) کشکول نعمت
(۹) نصیحت نامہ
(۱۰) مکاتیب منظومہ
(۱۱) رسالہ انوار الضمائر از حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچی قدس سرہٗ
(۱۲) مجرّبات نعمت

یہ بارہ رسائل ”کلیات نعمت“ میں ہیں۔ ان کے علاوہ دو رسالے اور ہیں۔

(۱۳) مرحمت نامہ نعمت، اس کتاب میں خاندان اربعہ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ کے منظوم شجرے ہیں۔

(۱۴) بارہ ماسہ ہندی، یہ بارہ ماسہ مطبوعہ بارہ ماسہ کے سوا ہے، اس کی زبان سخت ہے، اردو داں کیا معنی، اچھے ہندی بھاکا جاننے والے بھی بمشکل سمجھ سکتے ہیں، یہ رسالہ غیر مطبوع ہے۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا عبد الغفار صاحب علیہ الرحمہ محدث مئو

رسول اکرم ﷺ سے جو چیز امت کو وراثۃً ملی ہے، اس کے دو شعبے ہیں، ایک علومِ نبوت، دوسرے انوار نبوت! علوم نبوت کا تعلق وراثت سے سب جانتے ہیں، اس علم کی بنیاد قرآن کریم ہے، اس کی شرح اور اس کا بیان احادیث رسول ہیں، اور ان دونوں کی مجموعی رہنمائی سے جو طریقۂ عمل اور طرزِ زندگی امت کو رسول اکرم ﷺ نے عطا فرمایا ہے، اسے سنت کہا جاتا ہے، اس سنت کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے: **علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین**، تم پر میری سنت اور اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کا اختیار کرنا لازم ہے۔ خلفاء راشدین کی سنت، نبی کریم ﷺ کی سنت سے کوئی علیٰحدہ چیز نہیں ہے، بلکہ آپ کی سنت کے بعض مخفی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا نام ہے، یہ سارے امور علوم نبوت کے وراثت کی تفصیلات ہیں۔

انوارِ نبوت کا تعلق قلب وجگر سے ہے، یہ علوم نبوت کی روح ہیں، ان کا حصول قلب کے تزکیہ پر موقوف ہے، جب قلب نفس کی خواہشوں سے پاک ہوجاتا ہے، عارضی اور جھوٹی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا ہے، طاعات وعبادات الٰہی میں اس کا ذوق ومزاج ڈھل جاتا ہے، حصول رضائے خداوندی اس کا نقطۂ مقصود بن جاتا ہے، فکر دنیا کا دباؤ اس پر سے اٹھ جاتا ہے اور آخرت کا اہتمام اس کی تمام فکروں کا مرجع بن جاتا ہے، تب وہ دل اس لائق ہوجاتا ہے کہ نور نبوت اس میں چمکے، اس نور کے بغیر عمل بے روح، زندگی بے جان اور ماحول بے برکت ہوتا ہے، نور نبوت کی تحصیل کا آغاز اخلاص نیت سے ہوتا ہے کہ جو بھی عمل ہو محض رضائے الٰہی کے لئے ہو، نہ دنیا مقصود نہ مال مطلوب، نہ اپنے نفس کی تسکین

سے مطلب ہو، نہ رسم ورواج کی پابندی کی وجہ سے ہو، نہ عزت نفس کی خاطر ہو اور نہ نیک نامی کی خواہش ہو۔

اور اس کی تکمیل مرتبۂ احسان پر ہوتی ہے، کہ ذات الٰہی کا استحضار ہمہ دم ایسا ہو جائے کہ وہ کبھی نگاہ قلب سے غائب نہ ہو، **أن تعبد الله كأنك تراه** ، اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم انھیں دیکھ رہے ہو۔

یہ دو شعبے پورے دین کو محیط ہیں، جن لوگوں نے علم کے شعبے میں اختصاص پیدا کیا اور ہمہ تن اسی خدمت میں مصروف رہے، گو کہ وہ دوسرے شعبہ کے فیوض وبرکات سے بہرہ یاب رہے، گو کہ وہ صاحب نسبت ومعرفت ہوئے، لیکن علم کا غلبہ ان پر رہا وہ اسی حیثیت سے جانے پہچانے گئے، اور بعض اصحاب علم جو علم وفضل میں مرتبۂ اختصاص پر فائز تھے، لیکن ان پر غلبہ سلوک وتصوف کا رہا وہ درویشی کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی **رحمہم اللہ** ، یہ سب حضرات نسبت مع اللہ اور معرفت خدوندی کے پیکر تھے، مگر ان پر غلبہ علم کا رہا، اور عالم ہونے کی حیثیت سے معروف ہوئے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں، حضرت شاہ غلام علی، حضرت شاہ عبد القادر دہلوی، حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری اور ان کے خلیفہ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری **رحمہم اللہ** یہ حضرات بڑے اصحاب علم وفضل تھے مگر ان پر درویشی اور سلوک وتصوف کا غلبہ رہا، اس لئے اسی حیثیت سے معروف ہوئے۔

حضرت مولانا عبد الغفار صاحب بھی انھیں بزرگوں میں ہیں جو نسبت مع اللہ میں کامل تھے، تصوف وطریقت میں مقام بلند رکھتے تھے، مگر اس حیثیت کا ظہور عام نہیں ہوا، ان پر علم وتدریس کا غلبہ رہا، اور اسی حیثیت سے معروف ہوئے۔

مولانا عبد الغفار صاحب کے والد محترم شیخ عبد اللہ صاحب عرصہ تک حضرت چاند

شاہ صاحب کی خدمت میں ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے، مولانا عبد الغفار صاحب نے اپنے والد کے حالات میں لکھا ہے کہ:

> ’’جب چاند شاہ صاحب ساکن ٹانڈہ سے مرید ہوئے، اور دو تین سال تک برابر آپ کی خدمت میں حاضر رہے، تصوف کا ایسا مذاق حاصل ہوا کہ سب کاروبار چھوڑ کر عزلت گزیں اور پورے متوکل ہوگئے، دس بارہ سال تک بجز ذکر و شغل اور کچھ مشغلہ نہ تھا، آپ کا دل تصوف سے ایسا رنگ گیا کہ ظاہری نمائش اور تصنع و تکلف سے سخت نفرت ہے، دنیا پرست، ابلہ فریب کو اپنی فراست سے بہت جلد پہچان لیتے ہیں، مذہب حنفی اور مشرب نقشبندی رکھتے ہیں، اسی وجہ سے سنت کی پابندی اور بدعت سے اجتناب خاص آپ کا مسلک ہے۔ (نخبۃ الافکار من سوانح ابی الانوار، ص:۱۷)

والد صاحب اس رنگ و مشرب کے ہوں تو سوچا جا سکتا ہے کہ قابل اور ذی استعداد فرزند کا رنگ کیا ہوگا، پھر حدیث شریف جن بزرگ سے پڑھی، وہ جہاں علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب تھے وہیں سلوک و تصوف اور نسبت و معرفت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے، یعنی امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ۔

چنانچہ والد گرامی کی نسبت فرزندی اور حضرت گنگوہی کی نسبت شاگردی نے اثر دکھایا، اور طالب علمی سے فراغت کے بعد آپ بھی حضرت چاند شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے بیعت ہوکر ذکر و شغل میں مشغول ہوئے، حضرت چاند شاہ صاحب نے شجرہ بھی عنایت فرمایا اور اجازت بیعت و ارشاد بھی دی، لیکن تعلیم و تدریس کی مشغولیت نے انھیں بیعت و ارشاد کی مہلت نہیں دی، مگر دل جو عشق الٰہی اور محبت نبوی کا ذوق آشنا تھا، وہ انھیں بار بار حضرت چاند شاہ صاحب کے خلیفہ ارشد جو باطنی احوال و مقامات کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک اپنے مرشد کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے یعنی حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب سیوانی کی خدمت میں بایں جلالت علمی لے جایا کرتا تھا، صرف اتنا ہی نہیں، مئو کے یہ محدث کبیر، شاہ نعمت اللہ صاحب کے خلیفۂ اول حضرت مولانا سیّد عبد اللہ صاحب کی خانقاہ میں بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔

شاہ صاحب جب مولانا عبدالغفار صاحب کا ذکر فرماتے تو بڑے اہتمام سے ذکر فرماتے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وہ بڑے محقق عالم تھے۔ (تاریخ ولی کامل)

مولانا عبدالغفار صاحب دادیہالی خاندان اصلاً قاسم آباد ضلع غازی پور کا باشندہ تھا، مولانا کے دادا کے دادا شیخ ہمت علی نے قاسم آباد کی سکونت ترک کر کے مئو کو وطن بنایا۔ مولانا ۲۰؍صفر ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے، مولانا کے دادا شیخ تراب علی اور پردادا شیخ میہاں، سیّد زاہد علی نصیر آبادی سے بیعت تھے، اور معلوم ہے کہ والد محترم شیخ عبداللہ، حضرت چاندشاہ صاحب سے بیعت تھے۔

گویا یہ خاندان ابـاً عن جدٍ بزرگوں کا خاندان تھا، جس میں محبت خداوندی، ذکر الٰہی، حب نبوی اور فکر آخرت کا چرچا تھا۔

حضرت مولانا نے ابتداءً اُردو فارسی کی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی، عربی کی تعلیم کامل الفن اساتذہ کی خدمت میں رہ کر حاصل کی، علم حدیث کی تحصیل کے لئے فرنگی محل حضرت مولانا عبدالحی صاحب محدث کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن وہ بہت بیمار تھے، انھوں نے وعدہ کیا کہ صحت ہوجائے گی تو پڑھاؤں گا، مگر مولانا اس مرض سے جانبر نہ ہوسکے، مولانا کی حاضری کے چند ہی دن بعد ۳۰؍ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کو ان کا وصال ہوگیا۔

مولانا عبدالغفار صاحب بہت دل شکستہ ہوئے، اور لکھنؤ میں رہ کر علم طب میں مہارت حاصل کی، اپنے ذوق وشوق اور محنت وکاوش کی بدولت صرف ایک سال میں یہ فن آپ نے بدرجۂ کمال حاصل کرلیا، لیکن علم حدیث پڑھنے کی جو دھن دل میں سمائی تھی، اور جس کے لئے انھوں نے لکھنؤ کا سفر کیا تھا، اس سے غافل نہیں ہوئے۔

اس وقت گنگوہ ضلع سہارن پور میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی علم حدیث کا نور پھیلا رہے تھے، اس میں شبہ نہیں کہ اس دور کی برکتیں حضرت گنگوہی کی ذات اور ان کے درس میں سمٹ آئی تھیں، وہ اعلیٰ درجہ کے صاحب نسبت بزرگ اور نہایت

متبع سنت اور بافیض محدث اور استاذ حدیث تھے، مولانا کا درس اس وقت عروج پر تھا، ۱۳۰۵ھ میں مولانا عبدالغفار صاحب نے گنگوہ کا قصد کیا، اور حضرت گنگوہی سے صحاح ستہ کی تکمیل کی، حضرت نے انھیں صحاح ستہ کے علاوہ باقی کتابوں کی بھی کواجازت عطا فرمائی۔

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب نے طالب علمی کے دور ہی سے تدریس کا آغاز کر دیا تھا، فارغ ہونے کے بعد آپ تدریس کے لئے یکسو ہو گئے، متعدد جگہوں پر رہ کر آپ نے علم کا نور پھیلایا۔ آپ کے تلامذہ میں نہایت جیدالاستعداد اور بڑے علماء ہیں، خصوصیت کے ساتھ علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور محدث ہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نوراللہ مراقدہما معروف ہوئے، یہ دونوں حضرات اپنے علم وفضل اور جلالت شان کے لحاظ سے بجائے خود امت ہیں۔

بیعت: گزر چکا ہے کہ مولانا کا پورا گھرانا عشق الٰہی اور حب نبوی کا ذوق آشنا تھا، مولانا کے دل میں بھی محبت ایمانی کا شعلہ پرورش پا رہا تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۰۹ھ میں مولانا نے اپنے والد گرامی کے شیخ ومرشد حضرت چاندشاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی، شاہ صاحب نے سلسلہ نقشبندیہ میں داخل کر کے شجرہ عنایت فرمایا، بیعت کے بعد بار بار اس مقدس بارگاہ میں حاضری دیتے رہے، حضرت میاں صاحب کا وصال ۱۳۱۷ھ کے اواخر میں ہوا۔ اس مدت میں مکرر حاضری کا التزام رہا، بالخصوص جس سال میاں صاحب کی وفات ہوئی بار بار حاضری دی، میاں صاحب نے بیعت کی اجازت بھی دی تھی، مگر علمی مصروفیات اور مزاجی انکسار کی وجہ سے بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری نہیں فرمایا، میاں صاحب کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ خاص اور ان کے ہو بہو ہم رنگ بزرگ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے پاس بار بار تشریف لے جایا کرتے تھے، ۱۳۴۱ھ میں مولانا کا وصال ہوا۔ غفر اللہ لہ

* * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلطان العارفین

حضرت سلطان شاہ صاحب جونپوری قدس سرہ

المتوفی ۱۳۴۳ھ موافق ۱۹۲۴ء

حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب جلال پوری رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۴۱۰ھ (۱۹۹۰ء) مشرقی یوپی کے مشہور خطیب اور عالم تھے، ان کی تقریروں کی گونج ابھی تک کانوں میں موجود ہے۔ مولانا جس طرح تقریر وخطابت کے بادشاہ تھے، اسی طرح مجلسی گفتگو کے بھی امام تھے، اتنی مرصع اور دلچسپ گفتگو ہوتی تھی کہ بس ؎ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

ان کی ایک مجلس میں مَیں حاضر تھا، کسی سلسلہ گفتگو میں اپنے استاذ مکرم حضرت مولانا جمیل احمد صاحب جونپوری کا ذکر جمیل انھوں نے شروع کیا، اور باتوں کا دائرہ پھیلا تو استاذ محترم کے دادا حضرت سلطان شاہ تک بات پہونچی، مجھے پہلی مرتبہ انھیں کی زبانی معلوم ہوا کہ سلطان شاہ صاحب حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈہ کے مشہور بزرگ کے مرید وخلیفہ تھے، انھوں نے سنایا کہ:

سلطان شاہ صاحب کو کسی بزرگ کی خدمت میں حاضری اور بیعت کا شوق ہوا، اس وقت کچھوچھہ کی خانقاہ مشہور تھی، یہ آستانہ معروف تھا، کسی کو مرید ہونے کا خیال ہوتا، تو کچھوچھہ کا تصور پہلے آتا، چنانچہ حضرت سلطان شاہ کچھ پیدل اور کچھ سواری پر چل کر کچھوچھہ حاضر ہوئے، یہ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی بات ہے، اس وقت سواریوں کی سہولت نہ تھی۔ شاہ صاحب کسی طرح منزل مقصود تک پہونچے، اس وقت جو پیر صاحب سجادہ نشین

تھے، بہت خوبصورت وجیہ اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے، انھیں دیکھ کر آدمی متاثر ہوتا تھا، شاہ صاحب ان کی خدمت میں پہونچے تو انھوں نے آنے کا مقصد پوچھا، شاہ صاحب نے جواب دیا کہ مجھے پیر کی تلاش ہے، آپ کی شہرت سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، انھوں نے برجستہ اپنی بولی میں فرمایا کہ جلدی سے وضو کر کے آجاؤ، میرے جیسا پیر تم کو نہیں ملے گا۔ شاہ صاحب نے نہایت معصومیت سے عرض کیا کہ آدمی بازار جاتا ہے، اور ایک پیسے کی ہانڈی خریدتا ہے، تو اسے بھی ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے، کہ صحیح ہے یا نہیں؟ یہ تو دین کا معاملہ ہے، میں بھی دیکھوں گا، اطمینان ہو جائے گا، تو مرید ہو جاؤں گا، پیر صاحب سادہ مزاج تھے، آج کل کے پیرزادوں کی طرح چھکے پنجے والے نہیں تھے، فرمایا کہ ٹھیک ہے، یہاں رہ کر دیکھ لو اطمینان ہو جائے، تو مرید ہو جانا۔ شاہ صاحب تین دن وہاں رہے، اس کے بعد وہ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پیر صاحب نے سادگی میں پوچھا کہ وضو کر کے آئے ہو، عرض کیا کہ نہیں، مجھے یہاں مرید نہیں ہونا ہے، اور دل میں کہا کہ یہاں صرف دنیاداری ہے، پیر صاحب نے کہا بہتر ہے، پھر اور کوئی پیر دیکھو، شاہ صاحب وہاں سے لوٹ آئے۔ اکبر پور پہونچے، تو ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی، جو صاحب ذکر معلوم ہوئے۔ بات چیت کے دوران انھوں نے ان کا مقصد سفر پوچھا، انھوں نے ساری تفصیل بتادی، اور کچھوچھہ کی پوری داستان دہرادی۔ ان صاحب نے سن کر کہا کہ آپ ٹانڈہ چلے جائیں، وہاں ایک پیر صاحب ہیں، ''چاند شاہ'' ان سے مل لیں۔ وہاں شاید آپ کو تسلی ہو۔ شاہ صاحب وہیں سے ٹانڈہ کے لئے روانہ ہو گئے، حضرت چاند شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے تعارف اور خیریت کے بعد آنے کا مقصد پوچھا۔ عرض کیا مرشد کی تلاش میں نکلا ہوں۔ فرمایا بہت اچھا ارادہ ہے میں تو بوڑھا ہو رہا ہوں۔ تم جوان ہو، تلاش کرو، کوئی اچھا مرشد مل جائے تو مجھے بھی بتاؤ۔ میں بھی حاضر ہوں گا، عرض کیا حضرت میں تو یہ سن کر آیا ہوں کہ آپ بھی پیرو مرشد ہیں۔ میں یہاں رہوں گا۔ فرمایا رہو، اور جیب میں

ہاتھ ڈال کر اسے ہلایا۔ اس میں چند سکے تھے، وہ آپس میں ٹکرا کر بجے تو فرمایا کہ یہاں تو صرف دنیاداری ہے۔ سلطان شاہ صاحب چونکے، کہ یہ تو انھوں نے وہی بات دہرادی، جو میں نے کچھوچھہ میں دل میں سوچی تھی۔ یہ بہت متاثر ہوئے، دو تین دن انھوں نے قیام کیا۔ یہاں انھیں سیرابی کا سامان ملا۔ اتباع سنت، شریعت کا پاس ولحاظ، اللہ پر توکل، دنیا سے زہد اور دنیاداروں سے استغنا، عبادت وریاضت کا زور، ایمان کی حلاوت، یقین کا نور، عشق الٰہی کا سرور۔ وہ سب کچھ ملا۔ جو انھیں مطلوب تھا۔ بیعت ہوگئے، بیعت کیا ہوئے، جذب ہوگئے۔ دل جو بے قرار تھا اسے قرار آ گیا۔

از برائے سجدہ کردن آستانے یافتم سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

سجدہ گزارنے کے لئے میں نے ایک آستانہ پالیا ہے۔ مجھے تو زمین ہی منظور تھی، خدا کا فضل دیکھئے کہ آسمان مل گیا۔

یہ سلطان شاہ کون تھے؟ کہاں کے تھے؟ اس روز ان کا نام پہلی مرتبہ سنا تھا۔ ایک واقعہ ان کا حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب مرحوم نے اسی مجلس میں اور سنایا تھا، جس کا آئندہ ذکر کروں گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ معلومات حاصل نہ کرسکا تھا۔ عرصہ کے بعد جب حضرت چاند شاہ صاحب اوران کے سلسلہ کی جستجو ہوئی تھی تو حضرت سلطان شاہ صاحب کے خانوادۂ عالی ہی کے ایک قابل احترام فاضل گرامی مولانا محمد اکرم صاحب نے اپنے والد مکرم حضرت مولانا محمد عثمان صاحب جونپوری کا ایک مضمون بھیجا، جو ۱۹۶۳ء میں ماہنامہ نظام کانپور میں شائع ہوا تھا، میں ان کا ممنون ہوں، اوراسی کی روشنی میں یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں، وہ اپنے مضمون میں خبر دیتے ہیں کہ:

جونپور شہر سے تقریباً دس میل (لگ بھگ پندرہ کیلومیٹر) شمال میں ایک موضع ہے، ''لپری'' شہاب الدین غوری نے ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۲ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا، پرتھوی راج سے مقابلہ ہوا، راجہ کو شکست ہوئی، شہاب الدین غوری نے اپنے غلام قطب الدین

ایک کو ہندوستان کی باگ دوڑ سونپی اور خود وہ چلا گیا، غوری خاندان کے بہت سے لوگ ہندوستان میں رہ پڑے، اسی خاندان کی ایک شاخ جونپور کے موضع لپری میں آباد ہوئی، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ گاؤں اس وقت اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں ٹھاکروں کی آبادی تھی، کچھ معمولی جھڑپ بھی شاید ہوئی تھی، حضرت سلطان شاہ صاحب کا تعلق اسی غوری خاندان سے تھا والد گرامی کا نام یاد علی تھا اور دادا کا نام بساون خان تھا۔

ولادت: سلطان شاہ صاحب کی ولادت ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں ہوئی، یہ وہ ہنگامہ خیز دور تھا، جب ہندوستانیوں نے بزور وقوت انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کی آخری کوشش کی تھی، مغل سلطنت کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد پورے طور سے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا، اس دور میں مسلمانوں کے رہنماؤں نے حکومت وسیاست سے ہٹ کر اسلام کے تحفظ کی راہ خانقاہوں اور مدارس میں ڈھونڈھی، مغربی یوپی میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے خلفاء ومتوسلین کی برگزیدہ جماعت تھی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور دوسرے علماء ومشائخ، وسط اتر پردیش میں حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآباد اوران کے حلقہ کے لوگ سرگرم عمل تھے، مشرقی، یوپی میں حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی اوران کے خلفاء ومریدین روشنی پھیلا رہے تھے۔

سلطان شاہ صاحب نے اس زمانے کے دستور کے مطابق فارسی اور اردو کی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی، والد بزرگوار چونکہ زیادہ تر سفر میں رہا کرتے تھے، اس لئے شاہ صاحب حصول علم کے لئے کہیں باہر نہ جاسکے، گھر میں گو کہ کوئی باقاعدہ تربیت دینے والا نہ تھا۔ مگر شاہ صاحب بچپن سے ہی نیک فطرت اور فرشتہ خصلت تھے، کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نماز کے بہت پابند تھے، جوانی کے حدود میں داخل ہوتے ہی فطری سعادت نے وہ زور کیا کہ سارے ماحول ومعاشرہ سے ہٹ کر یاد الٰہی میں سرگرم ہوگئے۔ گاؤں کی مسجد میں

زیادہ تر وقت گزرتا۔ دن رات اللہ کی یاد میں غرق رہتے، ذکر کا اتنا غلبہ ہوا کہ مسجد کی دیوار پر انھیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ جلی حرفوں میں نور کی روشنائی سے اللہ اللہ لکھا ہوا ہے یہ حالت ہوئی تو سینہ عشق الٰہی سے دہک اٹھا۔ ایک بے قراری پیدا ہوئی، تلاش مرشد کا جذبہ ابھرا، کیونکہ یہ راہ محبت بغیر کسی راہبر کے طے نہیں کی جاسکتی، تلاش مرشد میں وہ کچھوچھہ کے آستانے تک پہونچے، پھر وہاں سے ٹانڈہ حاضر ہوئے، تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں، شاہ صاحب سے بیعت ہونے کے بعد وطن تشریف لائے، عشق الٰہی کی آگ تو پہلے ہی سے دہک رہی تھی، اب اور بھڑک اٹھی، دنیا سے کوئی انس باقی نہ رہا، دن رات یاد الٰہی میں ڈوبے رہتے، گھر اور دَرا جنبی سے ہوگئے، دل کی شورش اور محبت کی سوزش اتنی بڑھی کہ آبادی سے وحشت ہوگئی، گاؤں سے دور پورب طرف میدان میں آکر رہنے لگے، جہاں آس پاس نہ کوئی آبادی تھی نہ کوئی آدم زاد! چٹیل میدان، نیچے زمین اوپر آسمان، یہیں ایک چھوٹی سی کٹیا بنالی، والدہ مشفقہ کو بیٹے کی تنہائی گوارا نہ ہوئی زندگی بھر کی رفیق اہلیہ مکرمہ اپنے شریک حیات کو تنہا کیوں کر چھوڑ دیتیں، یہ دونوں نیک بخت بھی اسی کٹیا میں آگئیں۔

اب یہ تین افراد پر مشتمل آبادی، میدان کی سنسان فضا میں آباد ہوگئی، شاہ صاحب کو تو بجز ذکر وفکر، مراقبہ ومجاہدہ کے اور کسی چیز کا ہوش نہ تھا، آرام وراحت سے کوئی کام نہ تھا، اللہ سے لو لگی ہوئی تھی، والد عموماً سفر میں رہتے تھے، وہ کسی سفر سے لوٹ کر آئے، اور نو جوان بیٹے کا یہ حال دیکھا تو انھوں نے سمجھانا چاہا، اور بہت دل سوزی کے ساتھ فرمایا کہ سلطان! تم یہاں کہاں آکر بس گئے ہو، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، نہ ہمدرد نہ غمگسار کیسے کیا ہوگا؟ والد کی اس بات سے ان کا دل دکھا، یہاں تو کچھ اور ہی دھن تھی، ادب ملحوظ نظر تھا، صرف اتنا کہا کہ ”ہم کیا آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔“

یہ جواب گرچہ بہت شائستگی سے دیا تھا، مگر محبت الٰہی کے جوش میں والد صاحب سے ایک طرح کی بے نیازی کا لہجہ تھا، اس لئے اس کا افسوس رہا کرتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ

زندگی میں اپنے والد کو ایک سخت بات کہہ دی تھی۔

عبادت و ریاضت کی دھن نے شاہ صاحب کو فقیرانہ صورت میں ڈھال دیا تھا، گاؤں والوں نے کبھی یہ رنگ ڈھنگ دیکھا نہ تھا، انھیں ایسا لگتا تھا کہ یہ نوجوان دیوانہ ہو گیا ہے، دنیاوی کسب و راحت کی جو امیدیں دنیا والے نوجوانوں سے وابستہ کرتے ہیں، وہ امیدیں ٹوٹتی نظر آئیں، تو لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں، اس علاقے میں حضرت چاند شاہ صاحب کے ایک خلیفہ مولانا شاہ قدرت اللہ صاحب علیہ الرحمۃ تشریف لایا کرتے تھے، چاند شاہ صاحب کے تعلق سے دونوں پیر بھائی تھے، ایک صاحب، اجازت و خلافت سے سرفراز ہو چکے تھے، دوسرے صاحب ابھی نو آموز تھے، لوگوں نے قدرت اللہ شاہ سے شاہ صاحب کی شکایت کی، مولانا قدرت اللہ شاہ نے فرمایا کہ ”بھائی سلطان! کاٹھ کا گھوڑا نہیں چلتا“ مطلب یہ تھا کہ یہ ظاہری فقیرانہ صورت جو آپ نے بنا کر رکھی ہے، اس سے کام نہیں چلتا، حقیقت اختیار کیجئے۔ ”دست بکار دل بیار“ والا مضمون چاہئے، شاہ صاحب نے کوئی جواب نہ دیا، مولانا قدرت اللہ شاہ صاحب جب ٹانڈہ حاضر ہوئے تو انھوں نے گاؤں والوں کی شکایت کا حضرت چاند شاہ صاحب سے تذکرہ کیا کہ سلطان جو حال ہی میں مرید ہو کر گئے ہیں، انھوں نے تو بالکل فقیرانہ ٹھاٹ اختیار کر لیا ہے۔ میں نے ان سے قاعدے سے رہنے کے لئے کہہ دیا ہے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ مولوی صاحب! آپ نے یہ کیا کر دیا ہے ”سلطان کا سینہ تو معرفت سے سرخ ہو چکا ہے“ مطلب یہ تھا کہ جس حقیقت کو اختیار کرنے کی تلقین آپ نے کی ہے، وہ انھیں پورے طور پر حاصل ہے، اور اسی حقیقت کی یافت نے یہ حال پیدا کر رکھا ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اس نوجوان نے پہلی ملاقات میں گوہر مراد کو پالیا، اور ہم مدتوں سے تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں، اور ابھی منزل دور ہے، یہ بات دلوں سے زبان پر آئی، یا حضرت چاند شاہ صاحب پر مکشوف ہوئی، انھوں نے فرمایا:

بھائی! جس کا ہاتھ خود اللہ تعالیٰ تھام لیں، دوسرے اس مقام تک کیسے پہونچ سکتے ہیں، کوشش کرتے رہو، یہاں نہیں تو قبر میں ان شاء اللہ روشنی ہو جائے گی۔

ابتداءً کٹیا بنی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو خام تھی، شاہ صاحب اور والدہ محترمہ اور اہلیہ مکرمہ کل تین آدمیوں کی آبادی تھی۔ مگر اللہ کا نام وہ نہیں جو مخفی رہ سکے، شاہ صاحب کی بزرگی کا شہرہ آہستہ آہستہ پھیلنے لگا، لوگ عقیدت مندانہ آتے، کوئی اللہ کا نام پوچھتا، کوئی دنیاوی غرض لے کر آتا، شاہ صاحب کی توجہ اور دعا سے دونوں طرح کے لوگ بامراد ہونے لگے وہاں پانی کی تکلیف تھی، ایک کنواں کھودا گیا، اب یہاں گھر بھی ہے، مسجد بھی ہے، وہی خانقاہ بھی ہے، کنواں بھی ہے۔ مہمان خانہ بھی ہے، شاہ صاحب کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا تھا۔

آپ کی زندگی بہت سادہ اور بے تکلف تھی، گفتگو دیہاتی لب ولہجہ میں بہت سادگی سے کرتے تھے، جو رنگ حضرت چاند شاہ صاحبؒ کا تھا بعینہٖ وہی رنگ یہاں بھی تھا، وہی تواضع، وہی مسکنت، وہ سادگی وہی بے تکلفی، وہی توکل، وہ استغناء، وہی زہد واتقاء، وہی گوشہ نشینی اور وہی یاد خدا میں محویت، نہ تقریر نہ وعظ، نہ مجلس کا نظام، کوئی کچھ پوچھتا تو سادگی سے بتا دیتے نصیحت چاہتا تو نصیحت فرما دیتے، ان کی سادگی دیکھ کر ان کے مقام بلند کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت کچھ نصیحت کر دیجئے فرمایا فروتنی اور بے نفسی اختیار کرو، اس سے سربلندی حاصل ہوگی، دیکھو گھور جس میں تمام کوڑے پھینکے جاتے ہیں، لوگ اسے خراب سمجھتے ہیں، لیکن ایک دن ایسا آتا ہے کہ لوگ اپنے سر پر اٹھاتے ہیں اور اپنے اچھے کھیتوں میں ڈالتے ہیں۔

ایک مہمان رات میں شاہ صاحب کے یہاں ٹھہرے، عشاء کی نماز کے بعد انھوں نے کہا کہ حضرت کچھ نصیحت فرمائیے، فرمایا کہ بھائی اب سو جاؤ، اگر اٹھ سکو تو رات میں تہجد

چار رکعت پڑھ لینا، عشاء کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کرنا بہتر نہیں ہے۔

شاہ صاحب کا معمول یہی تھا کہ عشاء کے بعد فوراً سو جاتے، اور بہت سویرے رات رہے اٹھ جاتے، تہجد اور وظائف کا سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔ پھر نماز فجر کا وقت ہوتا۔

شاہ صاحب اپنے کام زیادہ تر خود انجام دیتے، بلکہ دوسروں کے بھی کام کر دیا کرتے، خدمت کا جذبہ بے کراں تھا، گاؤں میں جب کبھی جانا ہوتا، اور کوئی شخص کام میں مصروف ہوتا، تو آپ بے تکلف اس کا ہاتھ بٹاتے، ایک مرتبہ گاؤں سے گھر کی جانب آرہے تھے راستے میں ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیاں پھاڑ رہا ہے، کلہاڑی اس کے ہاتھ سے لے لی، اور تمام لکڑیاں پھاڑ کر رکھ دیں۔

ایک روز اپنے دروازے سے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی کچھ سامان اپنے سر پر رکھے ہوئے اسٹیشن کی طرف جارہا ہے، اس کا بڑھاپا اور بوجھ دیکھ کر طبیعت بھر آئی، کون آدمی ہے، کچھ معلوم نہیں، کہاں جائے گا، یہ بھی نہیں خبر، اس کی طرف دوڑ پڑے، پوچھا کہاں جانا ہے، اس نے بتایا کہ اسٹیشن جانا ہے، فرمایا میں بھی چلتا ہوں، لائیے میں بھی کچھ سامان لیتا چلوں، اس کی گٹھری لے لی، اور اسٹیشن تک پہونچا دیا، وہاں تک اس بوڑھے مسافر کو پہونچا کر شاہ صاحب واپس ہوگئے، اس بوڑھے آدمی نے لپری والے شاہ صاحب کا نام سن رکھا تھا، اسٹیشن لپری گاؤں سے بہت زیادہ دور نہیں تھا، اسٹیشن پہونچ کر اسے خیال آیا کہ شاہ صاحب سے مل لینا چاہئے، اس نے اسٹیشن ماسٹر سے گاڑی کے بارے میں دریافت کیا کہ اگر وقت میں گنجائش ہو تو لپری والے شاہ صاحب سے مل کر آجاؤں۔ اسٹیشن ماسٹر شاہ صاحب سے واقف تھا، اس نے شاہ صاحب کو آتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا، اس نے کہا بڑے میاں! شاہ صاحب تو وہی تھے، جو تمہارے ساتھ یہاں تک آئے تھے، وہ بوڑھا دم بخود رہ گیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس نے اتنی بشاشت سے اس کا سامان ڈھویا ہے وہ شاہ صاحب ہی ہوں گے۔

یہ جذبۂ خدمت شاہ صاحب کا ذوق اور مزاج تھا، وہ اڑوس پڑوس کے غرباء ومساکین پر نظر رکھتے تھے، اپنے گھر کا غلہ اور ترکاریاں اکثر گاؤں والوں میں تقسیم فرما دیتے تھے، اکثر محتاج ومسکین خاص کھانے کے وقت آجاتے، انھیں بہت تواضع کے ساتھ کھانا کھلاتے۔

ایک بیوہ کی خدمت: شاہ صاحب کی زندگی کیا تھی؟ خدمت خلق کا ایک حسین ودلآویز مرقع تھی، ایک سے بڑھ کر ایک خدمت! لیکن ان کے پوتے حضرت مولانا محمد عثمان صاحب علیہ الرحمہ ایک ایسی خدمت کی خبر دیتے ہیں جس کو پڑھ کر طبیعت دنگ رہ جاتی ہے، وہ حضرات جو شان مشیخت رکھتے ہیں، ان کے بارے میں اس طرح کے کام کا تصور بھی مشکل ہے، مگر شاہ صاحب کا رنگ ہی اور تھا، مولانا لکھتے ہیں کہ گاؤں کی ایک بیوہ خاتون نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں فریاد کی کہ میرا بیٹا کلکتہ میں ہے، اور آنے کا نام نہیں لیتا، شاہ صاحب کا دل اس کی اس مصیبت سے بے قرار ہوگیا، انھوں نے اسے تسلی دی، اور وعدہ کیا کہ میں تمہارے بیٹے کو لے کر آؤں گا، شاہ صاحب نے صرف اس مقصد کے لئے کلکتہ کا سفر کیا، اور وہ بھی پیدل! تن تنہا نکل پڑے، اللہ جانے کتنی مدت سفر میں لگی ہوگی، پھر کلکتہ میں اسے ڈھونڈھنے میں کتنی مشقت ہوئی ہوگی، مگر شاہ صاحب اسے لے کر ہی آئے، اور دکھیاری ماں کے حوالے کیا اور اس کی خوشی کا سامان کیا۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست

حضرت شاہ صاحب، بہت امانت دار تھے، ان کی امانت داری مشہور تھی، حدیث میں ہے **لا ایمان لمن لا امانة له**، جس میں امانت داری نہیں، اس میں ایمان نہیں، حضرت شاہ صاحب تو مجسم ایمان تھے، پھر اگر امانت داری ان کا وصف خاص تھی تو ہونا ہی چاہئے، ایک شخص نے آپ کے پاس کچھ نقدی امانت رکھی، اس نے خرچ کرنے کا اختیار بھی دے دیا، اور یہ بھی وعدہ کیا کہ جب مجھے رقم واپس لینی ہوگی تو ایک ہفتہ پہلے اطلاع کر دوں

گا، تا کہ آپ کو زحمت نہ ہو، لیکن وہ ایک روز وعدہ کے برخلاف اچانک کسی سابقہ اطلاع کے بغیر اپنی رقم لینے آ گیا، آپ نے فرمایا کہ تمہارا وعدہ تھا کہ ایک ہفتہ پیشگی اطلاع کر کے آؤ گے، بروقت انتظام نہیں ہے، فلاں روز انتظام ہو سکے گا، اس نے کہا بہت اچھا میں اسی روز آ جاؤں گا، فرمایا کہ تم کو آنے کی ضرورت نہیں ہے، اب میں خود ہی رقم تمہارے پاس پہونچا دوں گا، چنانچہ شاہ صاحب نے ایسا ہی کیا۔

کرامات : سلطان شاہ صاحب بہت با کرامت بزرگ تھے، مگر ان حضرات کے یہاں کرامت سے بڑھ کر استقامت کا درجہ ہے، کرامات کی طرف نہ ان کو التفات تھا، اور نہ ان کے متوسلین کو اس کا زیادہ اہتمام تھا، مولانا محمد عثمان صاحب ایک مشہور کرامت کی خبری دیتے ہیں کہ ایک عورت نے شاہ صاحب کے پاس بطور امانت کے خاصی مقدار میں اشرفیاں اور چاندی کے سکے رکھے، اس کی خبر چوروں کو ہوگئی، رات میں چوروں نے گھر میں نقب لگائی اور ایک مقفل صندوق جس میں لوہا بھرا ہوا تھا باہر لے گئے، لیکن گھر سے نکلتے ہی راہ گم ہوگئی، صندوق کو گھر کے پاس ہی ایک کھیت میں چھوڑا، اور راستہ تلاش کرنے لگے، رات بھر سرگرداں رہے، مگر راستہ نہ ملا، اسی میں صبح ہوگئی، صبح کو چوروں نے شاہ صاحب سے معافی مانگی، چوری سے توبہ کی، یہ واقعہ ایسا مشہور ہوا کہ آج تک ان کے گھر کی طرف کسی نے نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی۔

شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتی تھیں، مگر جب کبھی شاہ صاحب فرمادیتے کہ پڑھ تو مشکل کتابیں بھی بلا تکلف پڑھتیں، امام غزالی کی کیمیائے سعادت، شاہ صاحب کے حکم سے پڑھا کرتیں، لیکن یہ جبھی تک ہوتا جب تک شاہ صاحب موجود ہوتے، ان کے ہٹ جانے پر سابقہ حالت پر آ جاتیں، وہ خود فرماتی تھیں کہ ان کے جانے کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا۔

حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ایک حافظ نابینا رہا کرتے تھے، وہ شاہ

صاحب پر فدا تھے، گھر بار چھوڑ کر شاہ صاحب کے یہاں پڑ رہے تھے، ان سے ایک مرتبہ نہ جانے کس حال اور کس شان سے فرمایا کہ حافظ صاحب! **استغفر اللہ** پڑھئے، پھر تو ایسا ہوا کہ مہینوں حافظ صاحب کی زبان پر بے اختیارانہ استغفر اللہ جاری رہا۔

فہم صحیح : اب جو واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں، اس کے راوی حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں، سلطان شاہ صاحب اصطلاحی طور پر گو کہ عالم نہ تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے دین کی وہ سمجھ عطا فرمائی تھی جس کو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ **من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین.** اللہ تعالیٰ کو جس بندے کے حق میں خیر منظور ہوتی ہے، اسے دین کے باب میں سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔

مولانا ضمیر احمد صاحب بتا رہے تھے سلطان شاہ صاحب کے منجھلے صاحبزادے حضرت مولانا دین محمد صاحب نے مشہور غیر مقلد عالم مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری کی خدمت میں حدیث کا درس لیا تھا، وہاں سے فارغ ہوکر گھر آئے تو استاذ کے اثر سے نمازوں میں رفع یدین کرنے لگے، شاہ صاحب نے انہیں پہلی دفعہ رفع یدین کرتے دیکھا تھا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو شاہ صاحب نے انھیں اپنے پاس بلایا، اور اپنے سادہ دیہاتی لہجہ میں مخاطب کیا کہ اے دِنُّو یہ نماز میں ہاتھ کیوں اٹھا رہے تھے، مولانا نے عرض کیا کہ بابا! نماز میں ہاتھ اٹھانا سنت ہے، فرمایا اچھا ہم کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ یہ سنت ہے، ہماری اتنی لمبی عمر ہوگئی اور کتنے عالم علماء سے ملاقات ہوئی مگر کسی نے نہ بتایا کہ یہ بھی سنت ہے، پھر کہنے لگے کہ گھر کا عالم بنانے میں کتنا فائدہ ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ سنت ہے، لیکن بھیا یہ تو بتاؤ کہ اتنی عمر ہوگئی، اور ہم نے اب تک نماز بغیر ہاتھ اٹھائے پڑھی ہے، تو وہ سب نماز تو خلاف سنت ہوئی، اب کیا کریں؟ مولانا نے عرض کیا نہیں بابا وہ خلاف سنت نہیں ہوئی، ہاتھ کا نہ اٹھانا بھی حدیث سے ثابت ہے، شاہ صاحب نے تب جھٹک کر فرمایا جب وہ بھی سنت ہے تب اسے چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے، ابھی لوگوں میں اختلاف شروع ہو جائے

گا، مولانا دین محمد صاحب سمجھ گئے اور انھوں نے رفع یدین ترک کر دیا۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، یہ واقعہ علماء دیوبند کے مشہور راوی امیر شاہ خاں صاحب نے بیان کیا ہے جسے ارواح ثلثہ میں نقل کیا گیا ہے، وہ یہ کہ ایک بار مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے نمازوں میں رفع یدین شروع کر دیا اس کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی سے عرض کیا گیا، انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی، قرآن کریم کے مشہور مترجم و مفسر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سے فرمایا کہ تم مولوی اسمٰعیل سے بات کرو، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب کے واسطے سے کہلوایا کہ تم رفع یدین چھوڑ دو، اس سے خواہ مخواہ فتنہ ہوگا، مولانا اسمٰعیل صاحب نے جواب دیا کہ اگر عوام کے فتنے کا خیال کیا جائے تو اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے: **من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهيدٍ** (جس نے میری امت کے بگاڑ کے وقت میری سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھاما، اس کے لئے سو شہیدوں کا اجر ہے) کیونکہ جو کوئی سنت متروکہ کو اختیار کرے گا عوام میں ضرور شورش ہوگی، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سے جب یہ جواب نقل کیا گیا تو فرمایا! ہم تو سمجھے تھے کہ اسمٰعیل عالم ہوگیا ہے۔ مگر وہ تو ایک حدیث کا معنی نہ سمجھا، یہ حکم تو اس وقت ہے جب سنت کے مقابل خلاف سنت ہو اور یہاں سنت کا مقابل خلاف سنت نہیں، بلکہ دوسری سنت ہے، کیونکہ جس طرح رفع یدین سنت ہے، یوں ہی ارسال (ترک رفع یدین) بھی سنت ہے، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اس پر خاموش رہے۔

دونوں واقعوں میں، اور دونوں کے جواب میں کس درجہ مطابقت ہے، ایک جواب ایک زبردست عالم کی زبان سے ہے، اس میں عالمانہ تفہیم پائی جاتی ہے، اور ایک جواب ایک ایسے شخص کی زبان سے ہے جو اصطلاحاً عالم نہ تھا، مگر دین کی سمجھ حاصل ہو چکی تھی، بزرگوں کی صحبت کی یہ برکت ہے۔

اولاد: شاہ صاحب، جب اس بیابان میں آباد ہوئے تھے تو تنہا اپنی والدہ اور اہلیہ کے ساتھ آباد ہوئے تھے، اور جب دنیا کو الوداع کہا تو ایک بھرا پرا کنبہ وجود میں آ چکا تھا، حضرت شاہ صاحب کے تین صاحبزادے ہوئے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں:

(۱) مولانا شاہ عبدالغفور صاحب، بے مثال ذہانت و ذکاوت کا عطیہ خدا کی طرف سے پایا تھا، بہت سادہ مزاج اور قلندر صفت بزرگ تھے۔

(۲) مولانا دین محمد صاحب جید عالم تھے، دہلی کے کسی مدرسہ سے فراغت حاصل کی تھی، جون پور اٹالہ مسجد میں زندگی بھر درس و تدریس کی خدمت انجام دی، اخیر میں شاہ گنج میں مدرسہ بدر الاسلام قائم کیا۔

(۳) مولانا شاہ سعید احمد صاحب، صاحب یقین و توکل، تا عمر گھر پر ہی رہے۔ ۲۲؍رجب ؁۱۳۹۱ھ مطابق ۱۴؍ستمبر ؁۱۹۷۱ء سہ شنبہ کو ان کا انتقال ہوا۔

صاحبزادیاں فاطمہ اور زینب تھیں۔

تینوں صاحبزادے صاحب اولاد ہوئے، مولانا دین محمد صاحب کے صاحبزادے مشہور ندوی عالم مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی تھے، مولانا شاہ سعید احمد صاحب کے پانچ صاحبزادے ہوئے۔ (۱) مولانا جمیل احمد صاحب (بانی و مہتمم مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج المتوفی: ۱۶؍اگست ؁۱۹۶۳ء مطابق ۲۵؍ربیع الاول ؁۱۳۸۳ھ جمعہ) ذی استعداد عالم ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال شاعر، اعلیٰ درجہ کے سخن فہم اور ماہر فن ادیب تھے۔ اردو، عربی اور فارسی تینوں زبان میں بے تکلف شعر کہتے تھے، ان کا مجموعۂ کلام ''فکر جمیل'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، ان کے حالات کیلئے ملاحظہ ہو ''ذکر جمیل'' مرتبہ مولانا عثمان احمد صاحب (۲) حافظ عقیل احمد صاحب المتوفی: ۳؍اپریل ؁۱۹۹۷ء (۳) مولانا احمد صاحب المتوفی: ۲۴؍جنوری ؁۱۹۹۰ء مطابق ۲۲؍جمادی الاخریٰ ؁۱۴۱۰ھ چہار شنبہ (۴) مولانا امین احمد صاحب المتوفی: ۱۱؍ذی الحجہ ؁۱۳۹۲ھ (جنوری ؁۱۹۷۳ء) (۵) اور مولانا عثمان احمد صاحب قاسمی (المتوفی: ۴؍جنوری

۱۹۹۸ء) یہ اپنے برادر اکبر مولانا جمیل احمد صاحب کی طرح بڑے عالم اور بہترین شاعر تھے، ان کا مجموعۂ کلام ''ہدیہ عثمانی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

وفات: حضرت سلطان شاہ صاحب کا وصال ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۹/ دسمبر ۱۹۲۴ء بروز سہ شنبہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. وفات کے وقت عمر شریف ۶۷/ سال کی تھی، نماز جنازہ بڑے صاحبزادے شاہ عبدالغفور صاحب علیہ الرحمۃ نے پڑھائی، مزار مبارک شاہ صاحب کے احاطہ میں بنایا گیا، تاریخ وفات پر مشتمل ایک قطعہ چھوٹے صاحبزادے مولانا شاہ سعید احمد صاحب نے لکھا جو بہت ہی معنی خیز ہے، اس کے ہر مصرع میں شاہ صاحب کی زندگی پر اجمالاً اشارہ نکلتا ہے۔

دریغا کہ شیخ ابونا المکرّم   محبّ خدا و رسول مدینہ
افسوس ہمارے والد مکرم خدا و رسول کے شیدا
ہمہ روز تا شب بہ شغل عبادت   دلیل ست بر قرب حق ایں قرینہ
دن بھر رات تک عبادت کی مشغولی قرب حق کی دلیل ہے
بروئش مزین زنور شریعت   درونش در معرفت را خزینہ
ان کا ظاہر نور شریعت سے مزین اور ان کا باطن معرفت خزانہ
زہے صرف ذکر الٰہی زبانش   خوشا سینۂ پاک از بغض و کینہ
کیا خوب ان کی زبان ذکر الٰہی میں مصروف، کیا خوب ان کا سینہ بغض و کینہ سے پاک
چناں بد کہ تا دور آخر مدامش   ہمان ذکر و فکر و قیام شبینہ
دور آخر تک وہ ہمیشہ اسی ذکر و فکر اور تہجد گزاری میں لگے رہے۔
سعیدا! چو جستیم سال وفاتش   شنیدیم واعارف سرخ سینہ
سعید! ان کی تاریخ وفات جب میں نے تلاش کی تو میں نے سنا واعارف سرخ سینہ (۱۳۴۳ھ)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا سیّدعبداللہ صاحب اہرولوی قدس سرہ

المتوفی: یکم رجمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ

دین اسلام جسے اللہ کی قبولیت حاصل ہے ایک سدابہار دین ہے، اس کا فیض کرم ہمیشہ دنیا پر برستا رہا، اور ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اس کے تحفظ اور ترقی وعروج کے لئے ہمہ جہت اور طاقتور شخصیات کو ابھارا ہے، جن سے اس دین کو تازگی ملی ہے، نئ زندگی حاصل ہوئی ہے اور فروغ ملا ہے، انھیں بزرگوں میں ایک شخصیت جس پر اب گمنامی کی تہیں دبیز ہوتی جارہی ہیں حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب اہرولوی کی بھی ہے، حضرت مولانا کے آباء واجداد صوبہ سندھ کے مشہور شہر لاڑکانہ کے قریب کسی گاؤں کے تھے، ان کے والد دو بھائی تھی، الٰہی بخش شہید، جو بڑے بھائی تھے، اور خدابخش مرحوم جو مولانا کے والد تھے، یہ دونوں بزرگوار حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کے قافلۂ جہاد کے رکن تھے ۱۸۷۵ء میں ہندوستانیوں نے جب پہلی بار انگریزوں کے خلاف اقدام کیا تھا، اس ہنگام میں الٰہی بخش صاحب کو انگریزوں نے میرٹھ میں پھانسی دے دی تھی۔ (بروایت سید سراج احمد صاحب) خدابخش بنگال کی ریاست مرشدآباد میں بس گئے تھے، پھر نواب مرشدآباد نے انھیں بلیا کے ایک قصبہ ریوتی میں کچھ زمین دے دی تو انھوں نے ریوتی کے باہر اپنا مکان بنالیا اور ایک مسجد تعمیر کی، حاجی خدابخش اسی مسجد کے احاطے میں مدفون ہیں۔

انھیں حاجی خدابخش کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ صاحب تھے، یہ معلوم

نہ ہوسکا کہ ان کی ولادت کس سن میں ہوئی تھی، لیکن اندازہ ہے ان کی ولادت کا سن ۱۲۷۵ھ کے لگ بھگ ہوگا، مولانا نے کہاں کہاں اور کس کس سے علم دین حاصل کیا، اب اس کو جاننے والا کوئی نہ رہا، علم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس زمانے کے اہل علم کے عام دستور کے مطابق مولانا کو معرفت وطریقت کا شوق پیدا ہوا۔ پورب کے علاقے میں اس وقت حضرت چاند شاہ صاحب کا شہرہ عام تھا، مولانا گھر سے نکلے اور ذوق وشوق میں پیدل ہی نکل کھڑے ہوئے، ایک لمبی مسافت طے کرکے ٹانڈہ حضرت چاند شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا کی وضع عالمانہ تھی شاہ صاحب نے آنے کی غرض دریافت کی، انھوں نے مدعا بیان کیا، آپ نے فرمایا کہ بھیا تم نوتن ہریا چلے جاؤ، اور شاہ نعمت اللہ صاحب کے بارے میں فرمایا کہ ان کے ہاتھ پر بیعت ہوجاؤ، مولانا ٹانڈہ سے پھر پیدل چلے، اور سیدھے اپنے منزل مقصود پر پہونچے، حضرت شاہ صاحب سے آنے کی غرض بیان کی، سن کر فرمایا کہ ”بھیا! توں ہم سے مرید ہویہّ کہ ہم تنہہ سے مرید ہویہ“ یعنی آپ ہم سے مرید ہوں گے یا ہم آپ سے مرید ہوں گے، مولانا نے عرض کیا کہ حضور! مجھے ٹانڈہ سے یہاں بھیجا گیا ہے، یہ سن کر شاہ صاحب نے ایک لمحہ سکوت کرکے فرمایا کہ جب انھوں نے آپ کو ہمارے پاس بھیجا ہے تو ہم آپ کو کہاں بھیجیں، اچھا بسم اللہ آجائیے۔

مجاهده وریاضت : ایک روز علی الصباح فجر کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ پانی کا یہ نالہ دیکھئے، اسی کے کنارے کنارے آگے بڑھتے جائیے، جہاں شام ہوجائے، اور وہاں ایک دو درخت ہوں، کوئی گاؤں گراؤں نہ ہو، کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ جائیے اور چالیس دن تک خاموشی سے عبادت میں لگ جائیے، کسی سے کوئی بات چیت نہ کیجئے گا، نہ کسی سے کچھ سوال کیجئے گا، بھوک پیاس کو برداشت کیجئے گا، کئی فاقے ہوجائیں تب بھی کسی سے کچھ نہ مانگئے، اگر خدا کچھ کھانے کو بھیج دے تو بوقت ضرورت اپنے ہاتھ کی تین انگلیوں سے کھائیے، اور دس لقمے سے زیادہ نہ کھائیے، اور جتنا ہوسکے برداشت

ہی کیجئے گا۔

چنانچہ مولانا اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق صبح سے شام تک چلتے رہے، غروب آفتاب کے وقت ایک ایسی جگہ پہونچے جس طرح کی جگہ کی نشاندہی حضرت نے فرمائی تھی، وہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، وہاں کچھ نہ تھا، نہ آبادی تھی، نہ کوئی چھپر تھا، نہ کنواں تھا، بس پانی کا ایک نالہ تھا جسے سوکھی نہر کہا جاتا تھا، ایسی جگہ پر بے تکلف بیٹھ جانا محض اطاعت اور طلب خدا میں حوصلہ کی بلندی کی وجہ سے ہوسکتا تھا، لیکن ہمت مرداں مدد خدا کا کرشمہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد ظاہر ہونے لگا، جس جگہ مولانا بیٹھے تھے وہ زمین ویران تھی مگر نالے کے آس پاس گھاس بہت تھی، اس جنگلی زمین کے پاس گاؤں کے چرواہے مویشیوں کو چرانے آتے تھے، ان چرواہوں نے دیکھا کہ اس سنسان اور ویران جنگل میں یہ بزرگ صفت آدمی آگئے ہیں اوران کے پاس کچھ کھانے پینے کا سامان نہیں ہے، تو اولاً تو انھوں نے ان سے پوچھنا چاہا لیکن وہاں تو گفتگو سے ممانعت تھی، کسی سے کچھ نہ بولے، تو ان چرواہوں نے ازخود یہ انتظام کیا کہ درخت پر دوسکہر باندھ کر لٹکا دیئے، اور ایک پر پانی کا گھڑا رکھ دیا اور دوسرے پر دودھ کی کہتری میں چوڑا ڈال کر رکھ دیا، اور پکار کر کہہ دیا کہ جب بھوک لگے کھا لیجئے گا، مولانا اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق کئی وقت گزرنے پر وہی دس لقمے کھا لیتے، لیکن چرواہے ہر روز دودھ کی کہتری بدل دیتے انھیں تعجب ہوتا کہ بابا کچھ کھاتے ہی نہیں، بہر حال وہ روزانہ دودھ بدلتے رہے، اور مولانا اپنی عبادت و ریاضت میں مشغول رہے، مدت پوری ہوئی تو شیخ و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے حکم دیا کہ وہیں جائیے اور اسی کو اپنا مستقر بنائیے۔

حضرت مولانا وہاں تنہا رہنے لگے ہمہ تن عبادت میں مصروف رہتے، کبھی کبھی نوتن اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری بھی دیتے، کبھی مرشد کی معیت میں ٹانڈہ کا بھی سفر ہوتا، اور حضرت چاندشاہ صاحب کے فیوض و برکات اور دعاؤں سے سرفراز ہوتے۔

ایک بار ان دونوں حضرات کو رخصت کرتے وقت حضرت چاند شاہ نے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو صدیق بنائے، حضرت شاہ صاحب کی مبارک دعا نے اپنا اثر دکھایا۔

حضرت شاہ صاحب کی توجہ : حضرت مولانا نے اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں تن تنہا اس جنگل بیابان میں اقامت اختیار کرلی، لیکن شاہ صاحب کی مسلسل توجہ ان کی طرف مبذول رہتی تھی، حضرت کو فکر تھی کہ کسی ایسے شخص کو ان کے پاس مستقل طور پر رکھ دیں جو ان کی ضروریات کا انتظام کرے، اور ان کو یاد الٰہی کے لئے فارغ رکھے، خدائی انتظام بھی عجیب ہوتا ہے، بزرگوں کے دل میں آئی ہوئی بات خدا کے یہاں مقبول ہوتی ہے، پھر اس کا غیب سے انتظام ہوتا ہے، غیبی انتظام کی اس داستان کو خود صاحب معاملہ کے فرزند جناب مختار صاحب کی زبانی سنئے کہ لذیذ بھی ہے، اللہ والوں کی شان بھی اس سے واضح ہوتی ہے اور اللہ کے لئے دنیا کو قربان کرنے کا جذبہ وحوصلہ بھی بیدار ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

میرے والد جن کا مشہور نام کریم خاں تھا، ریاست تمکوہی میں ملازم تھے، اور وہاں کے لوگوں سے ان کے کافی مراسم تھے، ایک قصور پر ایک کتے کو لوگوں کے کہنے سے انھوں نے زہر دیدیا تھا، اور وہ جہاں تھا وہیں مرگیا، اس کے چند روز کے بعد بیمار پڑے اور ایسا پڑے کہ ڈھائی سال تک اٹھنے بیٹھنے سے معذور رہے، چار پائی پر پاخانہ پیشاب کرنا پڑتا تھا، راجہ تمکوہی نے کلکتہ کے سول سرجن کو بلا کر دکھایا، اس نے وہاں ڈاکٹر شاہد علی خاں سے کہا کہ ان کو دق ہوگیا ہے (آج کل کی زبان میں ٹی بی) ایسے مریض ہزار میں ایک بچ جائیں تو غنیمت ہے، اور عوام کا گمان یہ تھا کہ جادو ہوا ہے، میری والدہ وہاں موجود تھیں، ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیوی کو بتادیا تھا، انھوں نے میری والدہ کو بتایا۔ اب تو ان کے لئے دنیا اندھیری ہوگئی، اس وقت میری پیدائش نہیں ہوئی تھی بلکہ کوئی اولاد نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو غیب سے اس کی مدد کرتے ہیں، ایسا ہی ہوا، کسی نے رائے دی کہ ان کو

نوتن حضرت میاں صاحب کے پاس بھیجا جائے، بہت نام سنا جاتا ہے، ہوسکتا ہے کہ ان کی دعاؤں کی برکت سے اچھے ہو جائیں، راجہ کی طرف سے ایک مخصوص سواری آئی، اس کے اندر پیال بچھا کر بستر لگا دیا گیا۔ چلتے وقت منشی متین الحق صاحب پیش کار نے جو والد صاحب کو بہت مانتے تھے، ایک خط سفارش کا حضرت کے نام لکھ دیا، اور والدہ نے حلوہ بنا کر تحفہ دیدیا، ساتھ میں گاڑی وان کے علاوہ کوئی نہ تھا تمکوہی سے نوتن دس کوس دور تھا، صبح کی چلی گاڑی رات میں پہونچی، میاں صاحب نے دریافت کیا کہ سواری کہاں سے آئی، گاڑی وان نے جواب دیا تمکوہی راج سے، میاں نے جواب دیا رات بھر بسر کرو، صبح دیکھا جائے گا، صبح کو جب اپنے معمولات سے فارغ ہوئے تو بلوا بھیجا، گاڑی وان اپنی پیٹھ پر لاد کر والد صاحب کو میاں صاحب کے سامنے لایا، والد صاحب نے اس خط کو پیش کیا اور ساتھ ہی ہدیہ بھی، میاں نے خط پڑھا اور تحفہ لے کر نوش کرتے ہوئے دریافت کیا کہ کس چیز کا ہے؟ والد نے بتایا کہ انڈے کا حلوہ ہے، فرمانے لگے آج پہلا اتفاق ہے، ایسی چیز کہاں کوئی بناتا ہے، اسے تو کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ ہے بہت عمدہ ذرا بھی انڈے کی بو اس میں نہیں ہے، پھر ارشاد فرمایا کہ ایک دعا بتا دیتے ہیں برابر پڑھنا، اور یہ بھی کہا تھا کہ کتے نے کوئی زیادہ نقصان تو کیا نہیں تھا، جان سے کیوں مار دیا، ڈھائی سال پہلے کی بات تھی، جس کو میاں نے کہا تھا، خیر کوئی بات نہیں، پڑھتے رہنا، اگر دق ہوگا تو تم سے دق ہو کر بھاگ جائے گا، اگر جادو ہوگا تو جس طرح لوہے کے پہاڑ پر جستہ کی گولی بیکار ہو جاتی ہے جادو بھی بیکار ہو جائے گا، اچھا جاؤ پھر آنا۔

آنے کے بعد رفتہ رفتہ بلکہ جلد ہی صحت ہونے لگی، اور ایک ماہ میں اچھی طرح چلنے پھرنے لگے، جو بھی دیکھتا خوش ہوتا، اور میاں کی کرامت کہتا، جب خوب تندرست ہو گئے تو پھر وہی تحفہ لے کر حاضر خدمت ہوئے، میاں نے کہا کہ بھیا! راج کی نوکری چھوڑ دو اور اللہ میاں کی نوکری کرلو، والد نے کہا بسروچشم تیار ہوں، جیسا حکم حضور کا ہو، کہا کہ میں

نے اپنے ایک آدمی کو ادھر بٹھایا ہے، بس ان کی خدمت میں جا کر پڑ رہو دین و دنیا کا بھلا ہوگا، والد صاحب واپس آئے اور تلاش کر کے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، پھر وہیں پڑ رہے، ان کے کھانے کا جو پسماندہ بچا رہتا اس کو کھالیا کرتے۔

اللہ کی مدد : اسی خاموشی کے زمانہ میں راجہ سلیم گڈھ آیا اور کہا کہ ہمارا لڑکا مرگی کے مرض میں بہت پریشان ہے، کسی علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ مولانا نے اشارہ کیا وہ اس جگہ سے مٹی کا ایک بڑا ڈلا اٹھالایا، مولانا نے اس پر دم کردیا، وہ چلا گیا، اور مریض کے جسم پر مٹی لگاتا رہا، وہ بالکل اچھا ہوگیا، ایک روز وہ راجہ کی شان میں ہاتھی پر سوار ہوکر آیا اور کہا بابا! ہم سے کچھ مانگئے، مولانا نے کوئی جواب نہ دیا، اس نے دوبارہ کہا مگر مولانا خاموش رہے، تیسری بار اس نے کہا کہ کچھ مانگیں، فرمایا کیا مانگیں؟ جس نے تم کو دیا ہے وہ ہم کو دے گا، اس کو ناگوار معلوم ہوا اور واپس گاؤں پہونچا، لوگوں نے گھیر لیا وہ وہاں کے زمیندار کے یہاں ہاتھی سے اتر کر بڑے غرور سے بیٹھا، اور اکڑ کر بولا ارے وہ بوا بڑا گھمنڈی ہے۔ لوگوں نے کہا مہراج ایسی بات اپنی زبان سے نہ نکالئے، آپ کو معلوم نہیں، ہمارے گاؤں کے بچے بچے ان کی خدمت کرتے ہیں، بابا تو بہت اچھے ہیں، انھوں نے آج تک کسی سے کچھ نہیں مانگا، بلا مانگے ہمارے گھر کے لڑکے دودھ چھوڑ ارکھ آتے ہیں، جب ان کی خواہش ہوتی ہے کھالیتے ہیں، کبھی کبھی کئی روز تک نہیں کھاتے، آخر کیا بات ہے؟ اس نے واقعہ بتایا تو زمیندار نے کہا کہ مہراج ایسی بات پوچھی نہیں جاتی۔ آپ کو چاہئے تھا کہ ان کے لئے کچھ زمین دے کر جھونپڑی ڈلوا دیتے اور کیلا وغیرہ لگوا دیتے سادھو فقیر کو اور کیا چاہئے، اس نے کہا ہم تم لوگوں کو حکم دیتے ہیں، جس چیز کی ضرورت ہو بنوا دو، حکم ملتے ہی لوگوں نے اسی جگہ جھونپڑی ایک نماز پڑھنے کے لئے اور ایک رہنے کے لئے بنوادی، اور کیلا وغیرہ لگادیا، اسی دوران کریم خاں پہونچے تھے گاؤں والوں نے ان کو پہلے کے احوال بتائے۔

مزید عطیہ : کریم خاں سرکار دربار کے آداب سے واقف تھے، ایک بار

راجہ سلیم گڈھ کے دربار میں گئے اور کہا کہ آپ نے راجہ ہوکر ایک فقیر کو کیا دیا ہے، آپ کے راج میں ایسا فقیر آ گیا ہے تو کم از کم وہاں کا پورا جنگل دیجئے۔ آخر اس جنگل سے آپ کو کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ راجہ نے کہا کہ انھوں نے تو کچھ کہا ہی نہیں، کریم خاں نے کہا کہ وہ تو کچھ نہیں کہتے اور نہ کسی سے کچھ مانگتے، آپ کو تو خیال رکھنا چاہئے، راجہ نے کہا کہ اچھا وہ جنگل پانچ بیگھہ کا ہے وہ پورا دیدیتے ہیں۔

کریم خاں کو باغبانی کا بڑا شوق تھا، انھوں نے جنگل صاف کرا کے باغ لگا دیا، اس میں ترکاری وغیرہ بونے لگے، جب خاموشی کا دور ختم ہوا تو بات چیت ہونے لگی، جنگل میں ایک ایک جگہ حضرت مولانا نے غور سے دیکھی اور سب جگہوں کے لئے ایک ایک ضرورت کی چیز تجویز کرلی اللہ کا کرم شامل حال تھا، رفتہ رفتہ لوگوں کی آمد ہونے لگی، کیونکہ اس جنگل میں پورب کی جانب سے ایک کچی سڑک آتی تھی، اوراہرولی گاؤں سے ہوتی ہوئی تمکوہی راجہ کے قلعہ کے پاس سے گزرتی بہت دور چلی گئی ہے، جب نہر ندی کے شکل میں تھی تو وہاں گھاٹ تھا جہاں کشتی رہا کرتی تھی، اس نہر کے کنارے اونچی جگہ تھی، خانقاہ کے لئے قدرت نے بہت موزوں جگہ بنادی تھی، راجہ کے حکم سے جہاں گاؤں والوں نے جھونپڑی بنائی تھی وہ “کوٹی” کہلانے لگی تھی، آپ وہاں سے منتقل ہوکر نہر کے کنارے آگئے، یہاں سب سے پہلے کنواں بنوایا کنویں کے جانب شمال ایک کھپریل کچا مکان بھی بنوایا تا کہ اہل و عیال کی رہائش ہوسکے اس کے بعد دو ایک مکان پھونس کے اور بن گئے یہ خانقاہ “کوٹی” کے نام سے معروف ہوئی، اب بھی اسے “کوٹی” ہی کہا جاتا ہے، مولانا کو اہل ہنود بابا کہا کرتے تھے اہل علم اور سمجھدار طبقہ کے لوگ حضرت مولانا کہتے تھے۔

کوٹی میں آنے والے لوگ : حضرت نعمت اللہ شاہ صاحب قدس سرہ کی توجہ اس خانقاہ پر خصوصی رہا کرتی تھی، یہ بزرگوار اپنے خاص ارادت مندوں کو “کوٹی” پر مولانا کی صحبت میں اکثر و بیشتر بھیج دیا کرتے تھے، حضرت مولانا عبدالغفار

صاحب محدث مئوی جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کے شاگرد رشید اور محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے استاذ تھے، نیز چاندشاہ صاحب کے خلیفہ تھے، اور مولانا سید ابوالحسن صاحبؒ جو مولانا عبدالغفار صاحب کے چھوٹے بھائی اور حضرت چاندشاہ صاحب کے مرید تھے، نیز حضرت مولانا ریاض احمد صاحب چمپارنیؒ جو شاہ نعمت اللہ صاحب کے خلیفۂ دوم تھے، یہ سب حضرات اور دوسرے علماء و صلحاء برابر آیا کرتے تھے، اور قیام کرتے تھے، میاں صاحب (نعمت اللہ صاحب) اپنے خاص ارادت مندوں کو اہرولی کی اس خانقاہ میں ضرور بھیجتے تھے، اس طرح بہت جلد دور دور تک شہرت پہونچ گئی۔

حضرت شاہ صاحب کی نگاہ میں ان کی کیا قدر و قیمت تھی، اس کا اندازہ ان کے ایک ملفوظ سے ہوتا ہے، جو انھوں نے حضرت مولانا محمد جمیل صاحب سیوانی فخر المحد ثین مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ارشاد فرمایا تھا، مولانا فرماتے ہیں:

ایک بار حضرت نے ارشاد فرمایا کہ اہرولی جا کر مولوی عبداللہ شاہ صاحب سے ملو، وہ بڑے ہیں، ان کا بڑا حق ہے میں اس سے قبل اہرولی کبھی نہیں گیا، حسن اتفاق سے اس روز مولانا ابوالحسن صاحب ساکن مئوناتھ بھنجن آ گئے جو حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب کی خانقاہ میں اہرولی تشریف لے جاتے تھے، احقر بھی ان کے ہمراہ اہرولی چلا گیا۔ (خصائص نعمت)

تعمیر مسجد: کنواں بن گیا، نماز کے لئے اور رہائش کے لئے چھپر بن گئے، لوگوں کی آمد و رفت ہونے لگی، ضرورت محسوس ہوئی کہ باقاعدہ مسجد بن جائے، مولانا کوئی کام اپنے شیخ کی مرضی اور مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے، مسجد بنوانے کا ارادہ ہوا تو شاہ صاحب کی خدمت میں نوتن پہونچے، شاہ صاحب نے منظوری دی، مولانا نے عرض کیا کہ آپ تشریف لے چلیں اور مسجد کی بنیاد رکھیں تو بہتر ہوگا، شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھیا! تمہارا ہاتھ میرا ہی ہاتھ ہے، اب دو نہیں رہا، تم اپنے ہاتھ سے اینٹ رکھ دو، اللہ کامیاب کرے گا، مولانا کو اصرار کا یارا نہ تھا، لیکن حضرت کے تشریف نہ لانے کا اثر چہرہ پر ظاہر تھا،

خانقاہ پر پہونچے تو منتظم خانقاہ کریم خاں نے صورت حال کو بھانپ لیا۔ عرض کیا حضرت! کل میں جاؤں گا، دیکھیں کیسے نہیں آتے، آپ کی بات اور ہے، دوسرے روز کریم خاں نوتن پہونچ گئے، شاہ صاحب جانتے تھے کہ ان سے چھٹکارا مشکل ہے، پوچھا کہ کیسے آنا ہوا بھیا؟ کریم خاں نڈر آدمی تھے، شاہ صاحب سے بے تکلف بھی تھے، عرض کیا میاں! کوٹی میں مسجد نہیں بنے گی! کہا کیوں نہیں بنے گی؟ بولے کیسے بنے گی؟ آپ نہیں جائیں گے تو کیسے بنے گی؟ فرمایا ہمارا جانا کیا ضروری ہے؟ ہم نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اینٹ رکھ دیں، ان کا ہاتھ ہمارا ہی ہاتھ ہے، کریم خاں نے کہا کہ اس کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو چلنا ہوگا، شاہ صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کے بعد فرمایا بڑی مشکل ہے، تمہاری بات ٹلنی مشکل ہے، اچھا فلاں دن سواری بھیج دینا کریم خاں کی خوشی کی انتہا نہ رہی، واپس آئے، حضرت مولانا نے خوشی سے چمکتا ان کا چہرہ دیکھا تو سمجھ گئے، پھر کریم خاں نے سب تفصیل سنائی، ہر طرف اس کی خبر پھیل گئی، لوگ انتظامات میں لگ گئے، کہ میاں صاحب آتے ہیں، جوں جوں وقت قریب آتا گیا ہجوم بڑھتا گیا، لنگر خانہ میں سب سامان موجود تھا، کسی طرح کی کوئی دقت نہیں ہوئی۔

شاہ صاحب، تشریف لائے، تاریخ موعود پر بعد نماز ظہر شاہ صاحب بنیاد کے پاس کھڑے ہوئے، شاہ صاحب کے چند خلفاء بھی وہاں موجود تھے، حضرت مولانا نے اپنے ہاتھ سے اینٹ اٹھا کر حضرت کے ہاتھ میں دی۔ شاہ صاحب نے بنیاد رکھ دی۔

حضرت کی برکت سے مسجد کی تعمیر تیزی سے ہونے لگی ۱۳۳۲ھ سال تعمیر ہے۔ مسجد کی تعمیر مکمل کر چکنے کے بعد حضرت مولانا کے بعض خاص لوگوں نے اپنی رائے سے صحن مسجد کے دکھن پورب ایک دو کمرے مع برآمدے کے تعمیر کروائے اور جانب شمال ومشرق بھی ویسا ہی بنانے کا ارادہ کیا، شاہ صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے کہلایا کہ اس کی کیا ضرورت تھی، پس ناتمام تعمیر رک گئی۔

حضرت مولانا کا حجرہ : مسجد کے جنوب مشرق میں جو کمرہ تعمیر ہوا، اس میں مولانا عبادت وریاضت کرتے، اوراسی میں آرام بھی فرماتے۔ اس کے متعلق سید سراج احمد صاحب نے ایک عجیب بات بتائی کہ جس جگہ حضرت آرام فرماتے تھے، اس کے اوپر چھت کھلی ہوئی تھی، آسمان سے کوئی حجاب نہ تھا، حضرت مولانا ہمیشہ وہیں آرام فرماتے تھے، اور حیرت خیز بات یہ تھی کہ خواہ کتنی ہی بارش ہو، کوئی قطرہ اندرنہیں آتا تھا، اوردھوپ بھی تکلیف دہ نہیں ہوتی تھی، بعد میں اس کے اندر بارش کا پانی آنے لگا تھا، سید صاحب نے فرمایا کہ میں نے اسے بند کرادیا۔

اس کے بعد مولانا نے مہمانوں کے قیام کیلئے دوچار پھونس کے مکان بنوائے، مسجد کا صحن کچا ہی رہا، مویشیوں کے رہنے کا انتظام ہوا، ان کی نسل بڑھنے لگی، باغ بھی تیار ہوگیا، اب یہ جگہ ظاہری اعتبار سے بھی خوشنما اور شاداب نظر آنے لگی اور کافی لوگ ہروقت موجود رہنے لگے۔

حضرت شاہ صاحب کی کرامت : مسجد کی بنیادرکھنے کے بعد حضرت شاہ صاحب اپنی قیامگاہ پرتشریف لائے اورلوگ بھی آکر بیٹھ گئے، کریم خاں نے جو باغ لگایا تھااس میں پہلا پھل ایک پپیتہ تیار ہوا تھا، اسی کو تراش کر پیش کیا، حضرت شاہ صاحب ایک قاش اٹھا کرتھوڑا سا کھاتے اور بقیہ حاضرین مجلس میں سے کوئی لے کر کھالیتا، فرمایا کہ بہت عمدہ ہے، اس میں ہیک نہیں ہے، حضرت مولانا کے ایک مرید نے حضرت شاہ کو بہت مسرور دیکھا تو موقع پا کر عرض کیا کہ میاں! کریم بھائی نے مولانا کا باغ بہت شوق سے لگایا، اس کا پہلا پھل حضور نے بھی کھایا، مگران کا باغ نہیں لگا (مطلب یہ تھا کہ ان کے یہاں ابھی اولادنہیں ہوئی ہے) حضرت شاہ صاحب اس کا مطلب سمجھ گئے، تھوڑی دیر سکوت فرمایا، پھر ارشاد ہوا کہ جب اللہ میاں کی رحمت جوش میں آئے گی تو باغ ہی باغ ہوجائے گا، اس کا مطلب خاص لوگ توسمجھ گئے عام لوگ نہیں سمجھ سکے۔

جب شاہ صاحب وہاں سے رخصت ہو کر جانے لگے تو رخصتی سلام و مصافحہ کے لئے کریم خاں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے اپنی ٹوپی کریم خاں کے سر پر رکھ دی، اور حضرت مولانا سے فرمایا، مولانا! ان کو ذرا چھٹی دے دو، اپنے گھر سے ہو کر آئیں، اور ہاتھ اٹھا کر دعائیں کیں اور روانہ ہو گئے۔

چند ماہ کے بعد کریم خاں حضرت شاہ صاحب کے یہاں حاضر ہوئے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ گھر جاؤ مگر جلد ہی آ جانا، حسب الحکم وہ گھر گئے، اور جلد ہی واپس آئے، اور حضرت شاہ صاحب کو بتایا کہ آپ کی دعاؤں کی برکت سے امید ہو چکی ہے، فرمایا کہ ہاں اس کا نام عنایت اللہ رکھنا، چنانچہ ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں کریم خاں کے گھر بچہ تولد ہوا۔ حضرت مولانا اپنے ساتھ کریم خاں کو لے کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے دونوں کو ساتھ دیکھ کر فرمایا کہ کیا بات ہے کہ دونوں آدمی آئے ہیں، مولانا نے حضرت کو اطلاع دی کہ کریم خاں کے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے، حضرت نے تاریخی نام نکالنے کا حکم دیا، حضرت مولانا عبد الغفار صاحب محدث مئوی علیہ الرحمہ نے محمد مختار تجویز کیا، چنانچہ یہی نام رکھا گیا۔

خانقاہ میں مدرسہ : محمد مختار صاحب خبر دیتے ہیں کہ کوٹی پر ایک مدرسہ قائم ہوا، جس کا نام مدرسہ شمس العلوم رکھا گیا اس میں کافی لڑکے پڑھتے تھے، حضرت شاہ صاحب کے بھی دونوں صاحبزادے آئے، وہاں اچھے اچھے عالم تھے، عربی فارسی اردو کی تعلیم ہوتی تھی، حدیث و فقہ کا درس ہوتا تھا۔

مرشد کی خدمت اور دوسرے احوال : حضرت مولانا کو اپنے مرشد حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے بیحد محبت و عقیدت تھی، زبردست والہانہ لگاؤ تھا، ہمہ وقت ان کی خدمت کا دھیان رہتا تھا، مرشد سے یہی سچا تعلق ہوتا ہے، جو مرید کو درجات بلند پر فائز کرتا رہتا ہے، ان کا حال یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحب کی اولاد کی

شادیوں میں پورا سامان انھوں نے اپنے یہاں تیار کرا کے بھیجا، مرشد کے لئے ہر موسم میں اس کے مطابق کپڑے تیار کراتے، پہلے ان کے لئے بنواتے، پھر اپنے لئے بنواتے، جاڑے میں روئی دار پاجامہ، پوری آستین کا شلوکہ اور رضائی بنوا کر ہر سال بھیجتے، عیدین میں بھی کپڑے بنواتے۔

حضرت مولانا عموماً چارپائی پر بیٹھتے تھے، مگر بستر اور مسند کے بغیر، کتابوں کا مطالعہ برابر کرتے رہتے، دینی کتابیں بے شمار جمع ہوگئی تھیں، اچھا خاصا کتب خانہ ہوگیا۔

لنگر خانہ میں صبح کو جتنا کھانا پک جاتا، ظہر کے بعد تک رہتا، ہر آنے والے کو کھلایا جاتا، ظہر کے بعد سب کو تقسیم کر دیا جاتا، حضرت مولانا کا رعب وجلال اس درجہ تھا کہ سرکاری حکام بغیر اجازت کے خانقاہ میں قدم نہیں رکھتے تھے، تاہم مولانا حسب مرتبہ سب کا اکرام فرماتے۔

خانقاہ اہرولی میں ایک پہلوان : ایک دن خانقاہ میں الہ آباد کا ایک پہلوان جمن نامی آیا، وہ یہاں پناہ لینے آیا تھا، حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب نے اسے بھیجا تھا، اس کا قصہ عجیب ہوا، یہ شخص الہ آباد شہر کے مضافات کے ایک گاؤں مریاڈیہہ کا رہنے والا تھا، ایک روز یہ قضائے حاجت کے لئے رات میں میدان میں گیا ہوا تھا، واپس ہو رہا تھا کہ تین آدمیوں نے اسے گھیر لیا، ان کے پاس لاٹھیاں تھیں، یہ تنہا تھا، ہاتھ میں صرف لوٹا تھا، اس نے دیکھا کہ بچاؤ کا کوئی سامان نہیں ہے، تو اس نے کھینچ کر وہی لوٹا ایک کے سر پر دے مارا، وہ وہیں بیہوش ہوگیا، اس نے دوڑ کر اس کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی۔ اب وہ دونوں جمن پہلوان پر ٹوٹ پڑے، مگر اس نے اتنا زبردست وار کیا کہ دونوں وہیں مر گئے، جمن وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا، الہ آباد سے بھاگ کر وہ فیض آباد، حضرت شاہ نیاز احمد صاحب علیہ الرحمہ خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی خدمت میں پہونچا، شاہ صاحب نے فرمایا کہ تیرا بچنا مشکل ہے، اگر بچنا چاہتا ہے تو

حضرت نعمت اللہ شاہ صاحب کے پاس چلا جا، چنانچہ وہ پتہ لگاتے لگاتے شاہ صاحب کی خدمت میں آیا، شاہ صاحب نے اس کی روداد سن کر فرمایا کہ تم خانقاہ اہرولی چلے جاؤ، اور مولانا سے بھی کہو، وہ اہرولی پہونچا، حضرت مولانا سے سب حال بیان کیا اور رونے لگا، حضرت مولانا نے فرمایا کہ رونے کی ضرورت نہیں ہے، اسی جگہ پڑے رہو، اور بے فکر رہو، وہ مصیبت کا مارا وہیں پڑ گیا، اور مویشیوں کی خدمت کرنے لگا۔

ادھر الہ آباد میں یہ ہوا کہ پولس والے لاش اٹھا کر لے گئے، دو تو ختم ہی ہو چکے تھے، جو بے ہوش تھا، اسے ہسپتال میں داخل کر دیا، جب اسے ہوش آیا تو اس نے ساری روداد سنائی، اور پھر جمن کی پولیس کو تلاش ہوئی، گھر والوں کو کچھ خبر نہ تھی، پولیس نے گھر کے چودہ افراد کو گرفتار کر لیا، اور مکانوں میں سرکاری تالا لگا دیا، کچھ دنوں کے بعد وہ ضمانت پر رہا ہوئے اور جمن پر حلیہ وارنٹ جاری ہو گیا، بعد میں گھر والوں کو جمن کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ وہ اہرولی خانقاہ میں ہے، اس کے بعد گھر والے کبھی کبھی خانقاہ میں آنے لگے، مگر جمن پہلوان کو خانقاہ سے باہر جانے کا حکم نہیں ہوا، وہ خانقاہ ہی میں رہتا تھا۔

ایک روز اس علاقہ کے تھانے دار کو چوکیدار کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ الہ آباد کا ایک پہلوان جو خون کر کے آیا ہے، خانقاہ میں رہتا ہے، تھانے دار نے آ کر اجازت طلب کی، حضرت نے اجازت دی، وہ خانقاہ میں داخل ہوا، حضرت نے اسی پہلوان کو پکارا کہ کرسی لاؤ، داروغہ جی آئے ہیں، اور کچھ پان چھالیہ لاؤ، داروغہ پہلوان کو بہت غور سے دیکھنے لگا، حضرت نے فرمایا کہ دیکھ رہے ہو، ارے یہ تو تین خون کر کے آیا ہے، شاید وارنٹ آپ کے پاس بھی آیا ہوگا، کہا آیا ہے، حضرت نے کہا کہ اسے لے جاؤ، داروغہ نے کہا کہ بابا! میری ہمت نہیں ہے، اگر ان کو لے جائیں تو کہیں ہم بھی نہ چلے جائیں، کچھ دیر کے بعد داروغہ چلا گیا، اس کے بعد سرکل انسپکٹر آیا اس کی بھی خاطر تواضع پہلوان سے کرائی، پھر اس کا تعارف کرایا اور اس سے بھی فرمایا کہ اگر لے جانے کے لئے آئے ہیں تو لے جا سکتے ہیں، مگر

اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی، اس کے بعد کوئی نہیں آیا۔

الہ آباد میں مقدمہ چلتا رہا، پہلوان کے خلاف پولیس نے کیس بہت مضبوط کرلیا تھا، گواہوں کا بیان بھی ہو چکا تھا، حالانکہ واردات کے وقت کوئی بھی موجود نہ تھا لیکن پولیس نے گواہ تیار کرلئے تھے۔ جو لوگ ضمانت پر رہا ہوئے تھے، وہ مقدمہ کی پیری کررہے تھے، جب فیصلہ کی تاریخ پڑی تو اس کی اطلاع خانقاہ میں کی گئی، حضرت مولانا نے پہلوان سے کہا کہ اس تاریخ پر تم جاؤ تاکہ دوسرے لوگ زد میں نہ آجائیں، حسب ارشاد جمن کچہری میں حاضر ہوا، انداز پہلوانوں کا سا تھا، تہبند باندھے ہوئے، لانبا کرتا پہنے ہوئے، سر پر صافہ ہاتھ میں مرزا پوری لاٹھی، حاکم نے آتے ہی پوچھا تم کون ہو؟ جواب دیا کہ جمن پہلوان میرا ہی نام ہے، حاکم گھبرا سا گیا، حیرت زدہ ہوکر دوبارہ پوچھا کیا تمہیں جمن پہلوان ہو، بولا میں ہی ہوں، حاکم کچھ دیر دانتوں میں قلم دبائے بیٹھا رہا، آدمی باہر تک کھڑے تھے، کافی دیر غور کرنے کے بعد اس نے مسل پر کچھ لکھا اور کسی سے کہا کہ سنا دو، سنانے والے نے فیصلہ سنایا۔ ’’قتل سچا، قاتل یہی ہے، گواہ جھوٹے، اسی لئے مقدمہ خارج‘‘

پورا ہال خوشی سے جھوم اٹھا، جمن نے حاکم کو سلام کیا اور کہا کہ میرے لئے کیا حکم ہوتا ہے، کہا کہ جاؤ، انھوں نے کہا کہ مکانوں میں تالا بند ہے، حکم دیا جائے کہ کھول کر مکان ہم لوگوں کے حوالے کیا جائے، چنانچہ حکم ہوگیا اور خوشی خوشی چند روز رہ کر جمن خانقاہ میں چلا آیا، اور تمام لوگ حضرت کے معتقد ہوگئے، اور برابر آتے جاتے رہے۔

ایک عجیب واقعہ: سید سراج احمد صاحب نے حضرت مولانا کا ایک اور واقعہ سنایا کہ ایک بچہ اسی علاقے کا تھا، بہت چھوٹا تھا تو اس کی ماں کا انتقال ہوگیا، باپ نے دوسرا نکاح کرلیا، یہ لڑکا ماں سے محروم، دوسرے نکاح کے بعد باپ کی نظر شفقت سے بھی تقریباً محروم ہوگیا، اس بیچارے کو اتنی تکلیف ہونے لگی کہ پاس پڑوس والوں کو بھی رحم آنے لگا، محلّہ کی ایک بوڑھی خاتون اس بچے کو لے کر اور کچھ دوسرے بچوں کو لے کر حضرت

مولانا کی خدمت میں دعا کے لئے آئی، آپ نے اور بچوں کی طرف توجہ فرمائی، مگر اصل بچہ جو خاص طور سے مستحق دعا تھا اس کی طرف توجہ نہیں فرمائی، اس بڑھیا نے کئی مرتبہ مولانا کو متوجہ کیا لیکن حضرت اپنے حال پر رہے، اس نے ایک مرتبہ بہت زور دے کر کچھ کہا تو آپ نے فرمایا کہ تم اس کے لئے کیا کہتی ہو، ایک وقت ایسا آئے گا کہ ساری دنیا اس کی بات سنے گی وہ وہاں سے لوٹ آئی، اب اس بچے کا حال سنئے، یہ کچھ بڑا ہوا تو گھر سے بھاگ نکلا، اللہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں، پھر وہ لکھنؤ پہونچ گیا، ندوہ میں داخلہ لیا، اس کی ذہانت وذکاوت کے جوہر وہاں کھلنے لگے، وہاں سے فراغت حاصل کی، پھر دہلی آ گیا یہاں کچھ عرصے کے بعد وہ ریڈیو اسٹیشن کے عربی شعبہ سے وابستہ ہوگیا، ایک بار عربی میں تقریر نشر کرنے کے لئے کھڑا ہوا، اور زبان سے یہ مضمون ادا کیا کہ اس وقت میری آواز دنیا کے ہر گوشے میں سنی جارہی ہے، اتنا کہنا تھا کہ برسوں پرانی، بچپن کی یاد آئی وہ ان بزرگ کی خدمت میں خاتون کا لے جانا، دعا کی خصوصی درخواست کرنا، ان بزرگ کا متوجہ نہ ہونا، خاتون کا اصرار کرنا، حضرت کا فرمانا کہ اس کی آواز ساری دنیا سنے گی، یہ سارا منظر نگاہوں میں گھوم گیا، یہ کل کا بچہ اور آج کا ندوی عالم وفاضل از خود رفتہ ہوگیا، ہوش بجا نہ رہے، اپنے نائب کو تقریر نشر کرنے کا حکم دے کر فوراً گھر لوٹ آئے، طبیعت پر اثر تھا، پہلا کام یہ کیا کہ سفر کر کے وہ خانقاہ میں آئے، کئی دن قیام کیا، خانقاہ میں اب جو چھوٹا سا مکتب چل رہا ہے اس کے سرپرست وہی ہیں، یہ ہیں عالم وفاضل، عربی کی متعدد کتابوں کے مصنف مولانا عبدالحلیم صاحب ندوی پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی۔

قادیانیوں کی شورش :- حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب جس جگہ مقیم تھے، وہ جگہ اس وقت ضلع گورکھپور میں تھی، ابھی دیوریا ضلع نہ بنا تھا، گورکھپور میں پڈرونہ، کپتان گنج وغیرہ خاص مقامات تھے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد پڈرونہ میں قادیانیت کا فتنہ پھیلنا شروع ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے کافی بڑھ گیا، علماء کرام نے اس کا مقابلہ کیا، اس کی

روک تھام کی کوشش کی مگر یہ فتنہ رک نہیں رہا تھا، حضرت مولانا کو معلوم ہوا، تو آپ نے اس کی طرف توجہ دی، آپ کے انفاس قدسیہ کی برکت سے یہ فتنہ مدھم پڑا، بالآخر پڈرونہ کی مسجد میں حضرت کی سرپرستی میں ایک زبردست جلسہ ہوا، اور اس میں تمام قادیانیون نے دوبارہ اسلام قبول کیا، اور قادیانیت سے توبہ کی، اس کے بعد یہ فتنہ وہاں کمزور پڑ گیا۔

شدھی تحریک: ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے دوران خلافت تحریک کے نام سے خلافت عثمانہ ترکی کی حمایت میں ایک زبردست تحریک چلی، یہ تحریک انگریزوں کے خلاف پر امن بغاوت تھی، اور ہندوستان کی آزادی کی طرف ایک مضبوط قدم تھا، اس تحریک نے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کا ایک دلآویز نظارہ دکھایا، قریب تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کے قدم اکھڑ جاتے، لیکن قدرت کو ابھی منظور نہ تھا، انگریز فتنہ واختلاف کی سیاست کا پہلے بھی امام تھا، اور اب بھی ہے، اس نے ترکی میں خود ترکوں کے ہاتھوں خلافت کا خاتمہ کرادیا، جس کی وجہ سے یہاں کی خلافت تحریک خود بخود دم توڑنے لگی، تو دوسری طرف ہندوستان میں اس نے ہندو مسلم منافرت کا ایسا زہریلا بیج بویا کہ پورے ملک کی فضا زہر آلود ہوگئی، کچھ آریوں اور کچھ پنڈتوں کو آلۂ کار بنا کر انھوں نے مسلمانوں کے ان علاقوں میں جو علماء سے دور اور دینی تعلیم سے نابلد تھے، ارتداد پھیلانے کا منظّم پروگرام چلایا، مذہب سے محبت انسان کی روح میں داخل ہے، ہندو مسلم منافرت پھیلانے کے لئے ان کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اس منافرت کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ آج تک وہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں ملکانوں میں ارتداد پھیلا، اس تحریک ارتداد کو شدھی سنگٹھن کے نام سے شہرت ملی، اس کے مقابلے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے ایک انجمن ''مجلس نمائندگان تبلیغ'' کے نام سے سرگرم عمل ہوئی، بعد میں اس کا نام جمعیۃ تبلیغ الاسلام صوبہ جات متحدہ'' رکھا گیا۔

حضرت مولانا سید عبداللہ شاہ جس خطہ میں اپنے شیخ ومرشد کے حکم سے خانقاہ کا نظم

درست کررہے تھے، اس علاقے میں گدی برادری کے لوگ بکثرت آباد تھے، یہ لوگ مویشی پالتے تھے، اور دودھ کا کاروبار کرتے تھے، یہ مسلمان تھے، اکثر لوگ روزہ رکھتے تھے، بعض بعض نماز کے بھی پابند تھے، نماز جمعہ پڑھتے تھے، تمام اسلامی تہواروں کو مناتے تھے، مگر اس کے علاوہ مذہبی تعلیم کی انھیں کچھ خبر نہ تھی۔ اس علاقہ کے کئی تعلقہ دار ہندو تھے، جنھیں راجہ کہا جاتا تھا، راجہ سلیم گڈھ، راجہ تمکوہی، راجہ پڈرونہ، ان سب کی حمایت اور تائید سے گدی برادری میں ۱۹۲۷ء میں شدھی کی تحریک چلائی گئی، اور ہزاروں گدیوں کو مرتد بنالیا گیا، تمکوہی روڈ کے قریب گئو شالہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، بہت سے مسلمانوں کی اس میں داڑھیاں مونڈی گئیں، اور چُر کی رکھوائی گئی۔

حضرت مولانا کو یہ خبریں ملتی رہیں، ان کا اضطراب بڑھتا رہا، اس کے خلاف انھوں نے جدوجہد کا محاذ بنایا، ایک طرف ارتدادی تحریک کی پشت پناہی تین راجے کررہے تھے اور دوسری طرف ان کا مقابلہ ایک فقیر بے نوا کررہا تھا، جو اپنے گھر اور اپنے وطن سے دور ایک جنگل میں آباد کیا گیا تھا۔ آج اندازہ ہورہا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے کس فراست سے حضرت مولانا کو یہاں بیٹھایا تھا۔ حضرت مولانا نے اس طوفان بلا کا مقابلہ کرنے کے لئے انبالہ اور آگرہ سے مبلغوں کو دعوت دی، وہ لوگ آئے اور مولانا کی نگرانی میں ارتداد کا مقابلہ کرتے رہے۔ آگرہ سے سید غلام بھیک نیرنگ اور مولانا عبدالحی صاحب برابر آتے رہے، انجمن کی طرف سے مولانا امام الدین صاحب بھیجے گئے، جو مدتوں اس علاقے میں مقیم رہے، اور گاؤں گاؤں پھرتے رہے، مرتد ہونے والوں سے ملتے رہے، انھیں سمجھاتے رہے، مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور نے بھی اس میں کافی حصہ لیا، ان مبلغین کا سارا انتظام اور ان کے اخراجات کا نظم خانقاہ اہرولی سے ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کو کامیابی ملتی چلی گئی، اور مرتد ہونے والے بکثرت اسلام میں واپس آنے لگے، اخیر میں اہرولی کے قریب بلولا پٹی میں ایک زبردست جلسہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب

نائب امیر شریعت بہار کی صدارت میں ہوا، جس میں علماء کبار نے شرکت کی اور بے شمار اور بے حد وحساب مجمع ہوا۔ تین دن تک یہ جلسہ چلتا رہا، اور تمام گدی لوگ از سرنو مسلمان ہوئے، اس جلسہ کے رعب اور دبدبے کا عالم یہ تھا کہ تینوں راجاؤں نے علمائے اسلام سے معافی مانگی۔ اور آئندہ کے لئے وعدہ کیا کہ اب شدھی کی تحریک سے علیحدہ رہیں گے۔ حضرت مولانا کے پوتے سید سراج صاحب نے بتایا کہ تمام مرتدین اس وقت دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے، صرف ایک خاندان رہ گیا، جو مسلمان نہیں ہوا، اس جلسہ کے اخراجات کا سارا بار حضرت مولانا عبداللہ صاحب نے اٹھایا، اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنی بہت ساری زمینیں فروخت کردی تھیں۔

اس جلسہ کے بعد اور مرتدین کو مسلمان کر لینے کے بعد مولانا امام الدین صاحب نے یہاں کے اس طوفان ارتداد کی رپورٹ شائع کی، اس میں مولانا لکھتے ہیں:

> ’’علاقہ ارتداد میں ایک بزرگ ہیں، جن کے عربی نام کا اردو ترجمہ ’’اللہ کا بندہ‘‘ ہے ایک عالم باعمل اور بلا استثناء تمام خلق خدا کو فیض پہونچانا ان کا منشائے زندگی ہے، ان کا دروازہ ہر قوم وملت کے لئے کھلا ہوا ہے، نیز ضرورت مندوں کا ہر وقت تانتا لگا رہتا ہے، اور ہر شخص ان کی ذات سے مستفید ہوتا ہے، ان بزرگ نے تبلیغ واشاعت اسلام میں جو امداد ہم کو دی، وہ کوئی بڑے سے بڑا رئیس بھی نہیں دے سکتا، اللہ تعالیٰ ان کے تقدس اور بزرگی کو قائم رکھے اور حیات میں ترقی دے کہ مسلمان ان سے مستفید ہوں۔ (ص: ۳۱)

چاند شاہ صاحب کے سلسلۂ طریقت میں گمنامی اور خمول کا جو ذوق ہے، اس نے قبول نہیں کیا کہ مولانا کا نام اس تحریک ودعوت میں نمایاں طور سے آئے ورنہ درحقیقت کارنامہ کا سہرا انھیں کے سر بندھتا ہے۔

خانقاہ میں جو مدرسہ تھا، اب اس کی آبادی بڑھ گئی۔ ان مسلمانوں کے بچے جو از سر

نو ارتداد سے پلٹے تھے اس میں کثرت سے داخل ہونے لگے، حضرت مولانا نے بڑوں کو اپنے حلقۂ ارادت میں لے کر اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر کے پورے علاقہ کو سنبھالا۔

اللہ کی نشانیاں: اس ہنگامہ کے دور میں نصرت الٰہی کے عجیب عجیب نمونے ظاہر ہوتے رہے، جن سے یقین ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت متوجہ ہے۔ محمد مختار صاحب، اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ:

> شدھی والوں کے بڑے بڑے جلسے ہوتے اور راجہ کے سپاہی زبردستی لوگوں کو لے جا کر جلسہ میں شریک کرتے، ان کی داڑھیاں مونڈی جاتیں، سر پر چرکی رکھوائی جاتی، حالات ناگفتہ بہ ہو رہے تھے، عین جلسوں کے موقع پر جب کہ آریہ سماجی تقریر کرتے ہوتے، آندھیاں آتیں، پتھر برستے، پنڈال اڑ اڑ کر چلے جاتے، اس کے ستونوں اور چوبوں سے بہت سے لوگ گھائل ہو جاتے۔ (ص: ۹۷)

خانقاہ پر حملہ کی تیاری:

مختار صاحب لکھتے ہیں:

یہی نہیں بلکہ خانقاہ کو مٹانے اور مولانا کو ختم کر دینے کا خفیہ منصوبہ بنا کر راتوں رات حملہ کرنے کا منصوبہ روز بنایا جاتا، لیکن خانقاہ کے قریب تک، اس نیت سے آنا بھی آسان نہ تھا، ہمت پست ہو جاتی، راستہ دکھائی نہ دیتا۔ لوگ منتشر ہو جاتے۔ ص ۹۷

حضرت مولانا کے پوتے سید سراج احمد صاحب بتا رہے تھے کہ ایک بار غالباً راجہ تمکوہی نے اپنے سپاہیوں کو جمع کیا کہ آج خانقاہ پر حملہ کر کے اسے نیست و نابود کر دیا جائے، مولانا کو دوسری جگہ بھگا دیا جائے، مولانا مسجد کے پورب جنوبی حجرے میں جو ان کی عبادت گاہ تھا۔ اس میں تشریف فرما تھے، راجہ کا لشکر پچھّم سے آ رہا تھا، راستہ مسجد کے جنوب سے ہی تھا۔ دمبدم خبریں آ رہی تھیں، کہ راجہ اب یہاں تک آ گیا، قریب آتا چلا جا رہا ہے، یہاں تک

کہ اس نالے تک آ گیا جسے سوکھی نہر کہا جاتا تھا، یہ نالہ مسجد سے شاید ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہو، کچھ لوگوں نے آ کر حضرت کو بتایا بھی اور حضرت نے خود لشکر کا شور وغل سنا بھی، مگر ان پر اضطراب اور گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں تھا، بہت اطمینان سے اٹھے اور مسجد کے شمال کی جانب جہاں رہائشی مکان تھے ادھر تشریف لے گئے اور وہیں کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے، دعا سے فارغ ہوئے تو پچھّم دکھن کی جناب افق میں غور سے دیکھنے لگے، ابھی چند لمحے گذرے تھے کہ ادھر سے ایک تیز آندھی جو بالکل کالی تھی، اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے لشکر پر پہونچ گئی، اور اسے الٹ پلٹ کر دیا، راجہ اپنے ہاتھی سے گر کر ہاتھ پیر تڑوا بیٹھا، پورے لشکر میں آہ وواویلا مچ گئی، لطف یہ ہے کہ وہ آندھی خانقاہ کے حدود میں داخل نہیں ہوئی، باہر باہر شمال مشرق کی طرف بڑھ گئی، اور تھوڑی دور جا کر اس کا زور تھم گیا۔

اس ہنگامی دور میں حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب باحیات تھے، ان کی روحانی مدد اور ان کی دعائیں جاری تھیں۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہو گیا اور امن واطمینان ہو گیا تو اس کے کچھ دنوں کے بعد ۱۹۲۹ء میں شاہ صاحب کا وصال ہو گیا۔

حج کا ارادہ : یہ بڑا سخت آزمائشی دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جب اس سے نجات عطا فرمائی تو حضرت مولانا نے خاص دربار الٰہی مکہ مکرمہ حاضری کا قصد کیا۔ حج کا ارادہ لے کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اجازت ہو تو حج وزیارت کر آؤں، مولانا ایک بار حضرت شاہ صاحب کی معیت حج کر چکے تھے۔ اب پھر شوق غالب ہوا اور ان حالات کے بعد حج کا شوق پیدا ہونا فطری تھا۔ شیخ سے اجازت چاہی، شیخ نے فرمایا کہ بھیا! اس سال تو نہ جاؤ، آئندہ سال اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضرت کے اس ارشاد کی وجہ سے مولانا نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

حضرت شاہ صاحب کی وفات : مولانا اس کے بعد خانقاہ میں آ گئے، اور اطمینان سے بیعت وارشاد، تعلیم وتربیت اور افاضۂ خلائق کے کام میں سرگرم

ہوگئے، ۱۰/ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۸ھ گیارہ بجے دن میں کھانے سے فراغت کے بعد، مولانا باہر نکلے دیکھا کہ ایک آدمی جھپٹا ہوا چلا آرہا ہے، مولانا ٹھہر گئے، اس نے آتے ہی حضرت شاہ صاحب کا خط پیش کیا، اس نے بتایا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے، جس حال میں ہوں، یہ خط دیدینا، اس میں حضرت شاہ صاحب نے فوری طور پر مولانا کو طلب کیا تھا، مولانا نے پہلوان کو آواز دی، کپڑے درست کرو، ابھی جانا ہے، مولانا فوراً تیار ہوکر اسٹیشن روانہ ہوگئے، شام کے چار بجے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگئے، مرشد کی طبیعت خراب تھی، علاج معالجہ ہوتا رہا، مگر زندگی کی گھڑیاں تیزی سے ختم ہورہی تھیں، مختار صاحب بتاتے ہیں کہ رات کے ایک بجے حضرت نے ان تمام لوگوں کو جو حضرت کی علالت کی خبر سن کر بے قراری میں آئے تھے، ان کو اپنے حجرے میں آنے کی اجازت دی، سب لوگ کمرے کی گنجائش کے حساب سے داخل ہوتے، حضرت ہاتھ اٹھا کر صرف اتنا فرماتے۔ ''اے اللہ یہ جس نیت سے آئے ہیں، ان کا مقصد پورا کر۔'' جب سب فارغ ہوگئے تو فرمایا کہ اب ذرا آرام کریں گے، حضرت لیٹ گئے۔

کچھ دیر کے بعد مولانا کو بلایا، اور فرمایا، ہماری دولڑکیوں کی شادی نہیں ہوئی ہے، کرادینا، اور مسجد ابھی نامکمل رہ گئی ہے، اس کو پورا کروادینا، اور ہمارے لئے مسجد کے صحن میں اتر جانب جگہ ہے، ادھر کی دیوار بنوادی ہے، اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں، پھر پوچھا کیا وقت ہے، بتایا کہ دو بجنے والا ہے، فرمایا تیمّم کریں گے، جب تیمّم کر چکے تو فرمایا کہ اب ہماری طبیعت ٹھیک ہے، اب ہم سوئیں گے، اور تم لوگ بھی جاؤ اور سورہو، اتنا کہہ کر خود ہی چادر تان لی، تمام لوگ وہاں سے ہٹ گئے، حضرت کا لیٹنا تھا کہ چادر کے اندر سے اللہ اللہ کی آواز آنے لگی، جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی گئی، تھوڑی دیر کے بعد لا الٰہ الا اللہ کی آواز اتنے زور سے نکلی کہ لالٹین جو قریب ہی رکھی تھی، بجھ گئی، مولانا گھبرا کر اندر گئے، دوسری لالٹین لائی گئی، چہرے سے چادر ہٹائی گئی تو روح پاک پرواز کر چکی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اندر باہر کہرام مچ گیا، گریہ وبکا کا ایک شور اٹھا، سب بے خود تھے، اس نازک موقع پر حضرت مولانا سنت صدیق کے مطابق سنبھلے رہے۔ باہر جھپٹ کر آئے اور ڈانٹ کے لہجے میں فرمایا کہ اگر میاں کی روح، اسی سے خوش ہو تو ہم بھی اسی طرح روئیں، خدا کی پناہ ارے اس وقت تو خاموش ہو جاؤ بعد کو رو لینا اور عمر بھر تو رونا ہی ہے۔

صبح فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا نے کچھ فرمایا، اور آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے، آواز نہ تھی، مگر آنسو اتنے گرے کہ تولیہ بالکل بھیگ گیا۔

ظہر کی نماز کے بعد غسل اور تکفین کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی، شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا حافظ حفظ الرحمٰن صاحب نے نماز پڑھائی، دو تین روز قیام کر کے حضرت مولانا اہرولی تشریف لے آئے۔

اب کھلا کہ حضرت شاہ صاحب نے مولانا کو حج میں جانے سے جو منع کیا، اس میں منجانب اللہ یہ مصلحت تھی، یہ موقع ایسا تھا کہ شاہ صاحب کے دوسرے خلیفہ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب بھی وقت پر نہ پہونچ سکے، تین دن کے بعد تشریف لائے۔

سفر حج :- جس مقصد سے سفر حج ملتوی ہوا تھا، وہ مقصد پورا ہو چکا تھا، دوسرے سال حضرت نے پھر ارادہ کیا۔ اپنے ساتھ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب، ڈاکٹر شاہد علی خاں صاحب، حاجی عبدالوہاب صاحب، حاجی محمد صاحب، وارث علی میاں اور اپنے تیسرے صاحبزادے مولانا شاہ محمد ہارون کو لے کر سفر حج میں تشریف لے گئے، جب سفر سے واپس تشریف لائے تو ایسا بیٹھے کہ پھر کہیں بھی تشریف نہیں لے گئے، حج میں جانے سے پہلے ٹانڈہ اور اندروا (خانقاہ پیرومرشد) میں حاضری دے چکے تھے، پھر تاحیات اپنے مرکز سے نہیں اٹھے۔

پیرومرشد حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کا اصل وطن نوتن ہریا تھا، وفات سے چھ سال پہلے آپ نے وہاں سے باشارۂ غیبی ہجرت کی، اور اندروا عباد اللہ میں اقامت اختیار

فرمائی، اور وہیں وصال فرمایا، اندروا میں چھ سال مدتِ قیام ہے۔ حضرت مولانا کا اصل وطن ریوتی ضلع بلیا تھا، حضرت شاہ صاحب نے انھیں اہرولی کے جنگل میں بٹھایا، شاہ صاحب کی وفات کے بعد چھ سال تک اسی جگہ وہ رونق افروز رہے، پھر وہیں پہونچ گئے، جہاں پیر و مرشد پہونچ چکے تھے، پیر و مرشد کی فرقت کا غم انھیں اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا، اپنی خدمت کے فرائض سب بخوبی انجام دے رہے تھے، مگر غم کی ایک آگ تھی جو اندر سلگ رہی تھی، اور ہڈیوں تک کو سلگائے جارہی تھی، مولانا نے اس دوران مسجد کے سامنے برآمدہ بھی مکمل کرالیا، مسجد کا صحن بھی بنوالیا، ایک عمارت کتب خانہ کے لئے بنوالی، مولانا کے پاس کتابیں بہت زیادہ تعداد میں تھیں، ان کی حفاظت کا انتظام کیا، مسجد کے شمال میں اہل وعیال کے لئے دومنزلہ مکان بنوایا، یہ سب ہورہا تھا، مگر ’’غم اندرون‘‘ بیماری کی شکل میں اختیار کرتا جارہا تھا، آہستہ آہستہ بدن گھٹتا رہا۔

وفات : آخری ایام میں تو حال یہ ہوگیا تھا کہ کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی طاقت نہ رہی بیٹھ کر نماز ادا کرتے تھے، بلکہ یہ بھی نوبت آئی کہ لیٹ کر نماز پڑھنے لگے، خدام ہر وقت خدمت کے لئے مستعد رہتے، سب سے زیادہ خدمت صاحبزادۂ محترم مولانا شاہ محمد ہارون صاحب نے کی، وہ ہر وقت خدمت میں حاضر رہتے، اگر وہ نہ ہوتے، اور کوئی ضرورت ہوتی تو انھیں کو بلواتے، آخر میں غذا بالکل بند ہوگئی تھی، دوا پینی بھی مشکل تھی، اور بالکل آخر میں معاملہ عجیب ہوگیا تھا، اللہ والوں کی شان واقعی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے، اطباء نے کھانے پر اصرار کیا کہ ضعف بہت ہوجائے گا، تو کھانے کا جب وقت ہوتا تو اشارہ کرتے کہ کھانا لاؤ یا دوا کا وقت ہوتا، تو اشارہ کرتے کہ دوا لاؤ، مولانا محمد ہارون صاحب کھانا لاتے، یا دوا لاتے، تو فرماتے کہ تم کھاؤ یا دوا پیو، صاحبزادے صاحب کھاتے، جب دو تین لقمے کھالیتے تو اشارہ کرتے کہ بس! دوا بھی وہی پیتے، مولانا اشارہ فرماتے کہ بس! تو وہ رک جاتے، غرض صاحبزادۂ محترم کھاتے پیتے، اور حضرت مولانا کو تشفی ہوجاتی تھی، اسی حال میں

کئی دن گزرے۔

یکم جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ کو عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا نے اپنے صاحبزادوں میں سے ایک ایک کا نام لے کر پکارا، وہ لوگ حاضر ہوئے، ان سے فرماتے کہ کچھ سناؤ، آخر میں مولانا محمد ہارون صاحب سے فرمایا کہ تم کچھ سناؤ، انھوں نے قرآن کی آیت: قُلْ إِنَّ صَلٰواتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لاَ شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ، پڑھ کر سنائی، حضرت بہت خوش ہوئے، آپ کی تمام زندگی اسی آیت کے مطابق تھی اس لئے انشراح بہت ہوا، زبان سے فرمایا الحمد للہ اب تشفی ہوگئی۔ پھر آپ نے ان کے مقام قلب پر انگلی رکھ دی، اور کچھ دیر تک رکھے رہے، اللہ جانے اس میں کیا راز تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد حضرت کی روح اعلیٰ علیین میں حاضر ہوگئی۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**۔

جنازہ میں بڑا مجمع ہوا، دوسرے دن صبح کو خانقاہ کے ایک حصے میں، اللہ کے اس برگزیدہ ولی کو زمین کے سپرد کر دیا گیا، رہے نام اللہ کا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک باکمال عالم ودرویش

حضرت مولانا شاہ ریاض احمد صاحب چمپارنی نوراللہ مرقدہ

المتوفی ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء

سرزمین ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں شجرہ نقشبندیہ مجددیہ کے اندر، حضرت چاند شاہ صاحب قدس سرہ کی ذات اقدس سے، ایک مبارک اور بارآور شاخ کا اضافہ ہوا، پھر اس شاخ سے جو برگ وبار نکلے تو فیض آباد، سلطان پور، جونپور، اعظم گڈھ اضلاع مشرقی یوپی تو فیض یاب ہوئے ہی۔ ان سے آگے بڑھ کر مغربی بہار کے وہ اضلاع، جو یو. پی کے اضلاع سے متصل تھے، وہ بھی اس چاند کی تابانی سے چمک اٹھے، یہ روشنی بلیا اور گورکھپور سے آگے بڑھ کر ضلع سارن (موجود سیوان، چھپرا اور گوپال گنج) اور چمپارن اور بیتیا وغیرہ تک پھیلتی چلی گئی۔

ضلع سارن (موجودہ گوپال گنج) کے موضع نوتن سے ایک صاحب استعداد بزرگ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب، نوراللہ مرقدہ، بارگاہ خداوندی میں رسائی کا راستہ تلاش کرتے ہوئے، ٹانڈہ حضرت چاند شاہ کی خدمت میں پہنچے، اور وہاں ایک مدت تک رہ کر نور نبوت کی کرنیں اپنے سینۂ و دل میں جذب کرتے رہے، اور جب لوٹے ہیں، تو ہدایت و رہنمائی کے روشن ستارہ بن کر لوٹے یہ ستارہ بڑھتے بڑھتے بدر کامل بن گیا۔ اور حضرت شاہ صاحب، ہو بہو حضرت چاند شاہ صاحب کی تصویر بن گئے، ان کی روحانیت کی روشنی پھیلی تو

عشق الٰہی کے پروانے دور ونزدیک سے سمٹنے لگے آپ کے آستانہ عالیہ سے جن باکمال اصحاب کی تربیت ہوئی وہ ہیں تو بہت سے حضرات! مگر ان میں دو صاحبان نہایت باکمال ہوئے، ایک حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب بلیاوی ثم اہرولوی علیہ الرحمۃ، جو حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کی صحبت میں عرصہ دراز تک رہے، اوران کے خلیفۂ اعظم ہوئے۔ ان کے حالات گزر چکے۔

دوسرے باکمال عالم اور صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا شاہ ریاض احمد صاحب چمپارنی نوراللہ مرقدہ ہیں۔

بزرگوں کے اس سلسلہ پر نظر پڑتی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا کوئی مجمع تھا، جو زمین پر اتر آیا تھا۔ یہ لوگ روحانیت اور للّٰہیت کے رتبہ بلند پر تھے۔ مگر اپنے کو مٹانے اور چھپانے کا اتنا اہتمام کیا تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی جاننے نہ پائے۔ اور اس میں بڑی حد تک یہ حضرات کامیاب رہے۔ میں ان بزرگوں کا ذکر کاغذ پر لاتو رہا ہوں، مگر ان کی ارواح طیبہ سے شرمندہ بھی ہو رہا ہوں کہ کہیں بروز قیامت یہ حضرات دامن گیر نہ ہوں، کہ ہم نے تو اپنے نام کو مٹایا تھا، چھپایا تھا، تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ مٹی ہوئی چیز کو چمکانے کی فکر کر رہے تھے اور چھپے ہوئے سرمایہ کو سر عام لٹا رہے تھے۔

یہ میری محبت اور عقیدت کا تقاضا ہے جو ان بزرگوں کے ساتھ رکھتا ہوں، کہ جو بات میں نے جانی ہے، اسے دوسرے بھی جان لیں۔ شاید کسی زندگی میں سدھار آئے۔

ولادت: حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کی ولادت باسعادت ضلع چمپارن (بہار) کے ایک گمنام گاؤں سنت پور میں ہوئی۔ سن ولادت ۱۸۸۱ء تھا۔ والدین نیک تھے، گھرانہ دیندار تھا کہتے ہیں کہ مغل دور حکومت میں یہ خاندان بریلی میں تھا، کسی وجہ سے وہاں سے اٹھ کر ضلع سیوان میں آباد ہوا اس کے بعد چمپارن کے ایک گاؤں سنت پور میں اقامت گزیں ہوا۔

طالب علمی : ابتدائی تعلیم تو اس وقت کے عام دستور کے مطابق گھر گاؤں میں حاصل کی ، پھر مدرسہ اسلامیہ بتیا میں داخل ہوئے ، جہاں پانچ سال میں اس وقت کے کامیاب مدرس اور بزرگ عالم حضرت مولانا نیک محمد صاحب پانی پتی کی خدمت میں مشکوٰہ اور ترمذی شریف تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد چند ماہ تک مئو میں اس وقت کے مشہور محدث حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے اکتساب فیض کیا۔ اس کے بعد مزید علم کی جستجو میں ریاست رام پور میں پہونچے اور مدرسہ عالیہ میں مولانا فضل حق رامپوری المتوفی ۱۳۵۸ھ اور حضرت مولانا محمد طیب عرب المتوفی ۱۳۳۴ھ کی خدمت میں منطق وفلسفہ اور علوم عربیہ بلاغت وادب کی تکمیل کی مولانا محمد طیب صاحب اصلاً مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے، بعد میں ہندوستان کی وطنیت اختیار کرلی تھی، عربی ادب وشعر میں نہایت کمال حاصل تھا۔ اور اپنی یہ خوبی اپنے طالب علموں میں بھی منتقل کردیتے تھے، چنانچہ مولانا ریاض احمد صاحب بھی عربی کے جید ادیب تھے، اور بے تکلف فصیح عربی بول بھی لیتے تھے، اور لکھ بھی لیتے تھے۔

یہاں سے فراغت کے بعد گلاؤٹھی ضلع بلند شہر حضرت مولانا ماجد علی صاحب جونپوری المتوفی ۱۳۵۲ھ کی خدمت میں پہونچے، ان سے علم حدیث کی تکمیل کی، اسی زمانے میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری علیہ الرحمۃ بھی زیر تعلیم تھے، چنانچہ یہ دونوں بزرگ ہم سبق ہیں۔

درس حدیث سے فراغت کے بعد لکھنؤ آکر علم طب کی تحصیل کی، اور اس میں کمال پیدا کیا مولانا نے، اس دور کے مشہور استاذ منطق وادب حضرت مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔

شوق مطالعہ : اس اجمالی حکایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا ذوق علم کس قدر بلند، اور علم کی جستجو کس قدر زیادہ تھی۔ جہاں معلوم ہوا کہ کسی فن کا کوئی باکمال استاذ ہے۔ وہاں پہنچ گئے اوپر جن اساتذہ کا تذکرہ ہوا، یہ سب حضرات اپنے اپنے فن میں

کامل تھے، مگر ابھی شوق علم انھیں مزید گرما رہا تھا ہر طرح کے درس سے فراغت کے بعد مزید علم کی جستجو میں پٹنہ کی مشہور لائبریری خدابخش میں صرف مطالعہ کے لئے پہنچے۔ اور تین سال اس میں رہ کر نادر ونایاب کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ اللہ جانے اتنی مدت میں علم کا کتنا بڑا ذخیرہ اپنے دل ودماغ میں اتارا ہوگا، کثرت مطالعہ کی وجہ سے آپ کی بینائی کمزور ہوگئی تھی، مگر اس شوق میں کوئی کمی نہ تھی، ان کے نواسے سجاد احمد صاحب بتاتے ہیں کہ

۱۹۵۱ء میں سفر حج سے واپس تشریف لائے (عمر شریف اس وقت ستر سال تھی) تو تفسیر روح المعانی کی تمام جلدیں مکہ معظّمہ سے اپنے ساتھ لیتے آئے، اور ان سب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، مکاتیب ریاضیہ ص ۲۶۔

مدرسی : علم کا دریا قلب ودماغ میں انڈیل لینے کے بعد، حضرت مولانا نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے ایک جید عالم ہونے کی حیثیت سے کئی مدارس میں درس دیا، مدرسہ اسلامیہ بیتا ضلع چمپارن، مدرسہ حمیدیہ گودنا ضلع سارن، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، یہ وہ مدارس ہیں جہاں سے حضرت مولانا کا فیض جاری ہوا۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث تفسیر ادب، اور منطق ہر فن کی کتابیں آپ کے درس میں رہیں، تدریس کا زیادہ عرصہ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں گزرا ہے، اس وقت بہار میں اس مدرسہ کی بڑی اہمیت تھی، حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ کے بھتیجے مولانا عبدالوحید صاحب جو بیحد قابلیت، صلاحیت اور ذہانت کے مالک تھے، اور اسیران مالٹا کی فہرست میں وہ شامل تھے انھوں نے بھی مدرسہ عزیزیہ میں پڑھایا ہے۔ یہ دونوں بزرگ ایک زمانہ میں مدرس تھے مگر دونوں کے بےنفسی اور شوق علم کا یہ حال تھا کہ مولانا ریاض احمد صاحب ان سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور وہ مولانا ریاض احمد صاحب سے معقولات کی کتابیں پڑھتے، اس طرح دونوں نے ایک دوسرے سے کسب کمال کیا۔

دارالعلوم دیوبند میں : شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد

صاحب مدنی قدس سرہ نے اپنے دورِ صدارت میں دارالعلوم میں دورۂ حدیث کی طرح دورۂ تفسیر کا سلسلہ قائم فرمایا کہ طالب علم قرآنی علوم ومطالب کے اس ذخیرہ سے استفادہ کر سکے، جوامت کے بہترین دماغوں نے جمع کیا ہے حضرت شیخ کا خیال تھا کہ جس طرح حدیث کے لئے ایک شیخ الحدیث ہوتا ہے۔ اسی طرح تفسیر کے لئے ایک شیخ التفسیر بھی ہونا چاہئے، جس سے تفسیری امور میں رجوع کیا جا سکے۔ حضرت شیخ علیہ الرحمہ حضرت مولانا کو جانتے تھے۔ شاید ابتداءً انھوں نے اپنے بھتیجے مولانا عبدالوحید صاحب سے سنا ہو، پھر جمعیۃ علماء کے جلسوں میں ملاقاتیں ہوئی ہوں۔ بہرحال حضرت شیخ نے اس جوہر قابل کو پہچانا۔ اور دارالعلوم دیوبند میں انھیں بحیثیت شیخ التفسیر دعوت دی، لیکن علم وفضل کے باوجود ان کا جو ذوق گمنامی تھا، وہ دیوبند جانے سے مانع بن رہا تھا۔

۱۹؍فروری ۱۹۵۲ء کے ایک خط میں اپنے ایک متوسل کو تحریر فرماتے ہیں کہ دیوبند سے تقاضے کے خطوط آرہے ہیں، دل پریشان ہے کہ کیا کروں۔ مکاتیب ریاضیہ۔ ص ۱۶۵

بہرحال خاصی کشمکش کے بعد آپ دیوبند تشریف لے گئے، لیکن خرابی صحت اور آب وہوا کی ناموافقت کے باعث حضرت شیخ سے اجازت لے کر واپس آگئے، غالباً سال ڈیڑھ سال دیوبند میں قیام رہا، اس مختصر مدت میں ان کے علم وفضل کی اہمیت سب نے محسوس کر لی تھی۔

سیاسی نظریات: حضرت مولانا اپنے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل رکھتے تھے، انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہندستان کے مسلمانوں بالخصوص اور عالم اسلام پر بالعموم جو حالات گزر رہے تھے، اس سے حضرت مولانا بےچین رہتے تھے، اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً جو تحریکات اٹھیں، اور برگزیدہ علماء نے ان کا ساتھ دیا۔ مولانا بھی ان کے ساتھ شریک رہے، تحریک خلافت اور کانگریس کی تحریک آزادی میں آپ پیش پیش رہے، جمعیۃ علماء کے تو نہایت فدا کار سپاہی بلکہ بہار میں سالار کارواں رہے۔ امارت شرعیہ تو ان

کے گھر کی چیز تھی، امیر شریعت رابع کے انتخاب کے لئے جب مدرسہ رحمانیہ سپول ضلع دربھنگہ میں جمعیۃ علماء بہار کا عظیم الشان اجلاس ۲۱/۲۲ رشعبان ۱۳۷۶ھ، ۲۴/۲۵ رفروری ۱۹۵۷ء میں ہوا، جس میں حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی علیہ الرحمہ کو امیر شریعت رابع منتخب کیا گیا، اس اجلاس کی صدارت حضرت مولانا ریاض احمد صاحب علیہ الرحمۃ نے فرمائی۔

سلوک روحانی : حضرت مولانا ریاض احمد صاحب ابتداء عمر سے ہی نیکی اور طاعت وعبادت کا ذوق رکھتے تھے نوتن ضلع گوپال گنج میں حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب قدس سرہ خاموشی سے روحانیت کی بساط بچھائے ہوئے سلوک وعرفان کی خدمت کررہے تھے، حضرت مولانا نوجوانی ہی میں ان کی خدمت میں بغرض استفادہ حاضر ہوگئے تھے، مولانا نے خود فرمایا ہے کہ ’’میں نے بتیس سال حضرت میاں علیہ الرحمہ کی خدمت بابرکت میں حاضری دی‘‘ مولانا کی پیدائش ۱۸۸۱ء کی ہے، اور حضرت میاں صاحب کی وفات ۱۹۲۹ء میں ہوئی ہے، اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ سولہ سال کی عمر میں آپ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ اس طویل عرصہ میں کیا کچھ نعمتیں شیخ ومرشد کی جانب سے عطا ہوئی ہوں گی، اب کون بتا سکتا ہے۔ حضرت میاں صاحب کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ حضرت مولانا محمد جمیل صاحب سیوانی علیہ الرحمہ میاں صاحب کے ملفوظات جمع کر کے شائع کرنا چاہتے تھے، انھوں نے حضرت مولانا کی خدمت میں بھی خط لکھا کہ آپ کا طویل زمانہ حضرت میاں صاحب کی صحبت میں گزرا ہے، حضرت کے ملفوظات جو یاد ہوں، تحریر فرمائیں اس پر حضرت مولانا نے جو جواب لکھا ہے، اس سے حضرت میاں صاحب کی تعلیم اور حضرت مولانا کی استعداد صلاحیت اور اخذ فیض کا اندازہ کسی درجہ میں ہوتا ہے، مولانا لکھتے ہیں، ’’ملفوظات شریفہ کے عنوان کے تحت لکھنے کے لئے میری روایت وسند سے کوئی صحیح واقعہ بطور روایت باللفظ کے نہیں مل سکتا، اس لئے کہ مجھے اپنے حافظہ پر ہرگز اعتماد نہیں، ہاں اس میں شک نہیں کہ عرصہ تیس بتیس سال کی مدت تک مجھے شرف صحبت حاصل

ہوا۔ گاہ بگاہ مسلسل کتنے ایام خدمت میں رہا، لیکن نہ تو حضرت والا کو اس کی طرف توجہ تھی، اور نہ مجھ کو اس کا خیال ہوا۔ مجھے جو کچھ عمل کے لئے فرمایا، میں نے اس پر حتی الامکان عمل کیا۔‘‘

> ’’حضور اقدس کی تعلیم کا ادنی اثر یہ تھا کہ جمیع ما سوا کا تخیل قلب سے محو ہو جاتا تھا۔ اور جس نقطہ وجود پر استقرار کا ارشاد ہوتا تھا وہی سامنے رہتا تھا۔‘‘ مکاتیب ریاضیہ ص ۹۵۔

اللہ اکبر! یہ کتنا بلند مقام ہے کہ تمام ماسوی اللہ کا خیال تک دل سے محو ہو جائے، اور صرف اللہ کا استحضار قلب میں رہ جائے۔ فنا کا یہ وہ مقام ہے، کہ اس کے بعد سالک کی پرواز عالم قدس میں مسلسل ہوتی رہتی ہے۔ اب وہ ہمیشہ مائل بہ عروج ہی رہتا ہے، حق تعالیٰ پھر اپنی حکمتوں کے تحت اس عالم فانی کی طرف رجوع کا اذن فرماتے ہیں۔ وہ رہتا اسی دنیا میں ہے، مگر اس کا قلب، اس کی نظر، اس کا تخیل کسی اور ہی جہاں میں ہوتا ہے۔

حضرت مولانا کے بلند مقام شاگرد اور خلیفہ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب امیر شریعت خامس علیہ الرحمہ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

(۱۹۲۴ء میں) حضرت یک بیک مدرسہ سے الگ ہو کر سید الاولیاء حضرت الحاج شاہ نعمت اللہ قدس سرہ الاقدس کی خدمت عالیہ میں نوتن علاقہ گوپال گنج کمال طریقت کے لئے تشریف لے گئے، اور حضرت میاں نور اللہ مرقدہ کی نظر عنایت وتوجہ خاص سے تقریباً ڈیڑھ سال میں ولایت کے بلند مقام پر پہونچ گئے، جسے وہ اور اکابر سلسلہ ہی جانیں، مجھ سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ اسی قیام کے مبارک ایام میں ایک دن تہجد کے بعد مسجد کے کنارے بیٹھا تھا۔ حضرت شیخ المشائخ میاں رحمۃ اللہ علیہ یعنی حضرالحاج شاہ نعمت اللہ قدس سرہ نے فرمایا یہاں آیئے، ان کے پاس گیا، سینہ سے سینہ ملا کر ایسی توجہ ڈالی کی معلوم ہوا کہ روحانیت کا پاور ہاؤس قلب سے لگا دیا۔

خدا رسیدہ کی بات خدا رسیدہ ہی سمجھیں، شاید یہی توجہ ہو کہ زبدۃ الصالحین سلطان

المشائخ قطب الاقطاب حضرت مولانا بشارت کریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن مجھے ارشاد فرمایا کہ وہ تمہارے مولوی صاحب، کو شاہ صاحب بہت مانتے تھے، میں نے عرض کیا جی ہاں بہت مانتے تھے، ارشاد ہوا ہاں ایسی توجہ ڈالی ہے جس کا اثر آج بھی ہے۔

(مکاتیب ریاضیہ، ص: ۱۸)

حضرت میاں صاحب کس مرتبہ ومقام کے بزرگ تھے، اور ان کی خدمت میں سالک صالح اور مرید صادق کو کیا کچھ ملتا تھا، اس کی ایک جھلک خود حضرت مولانا نے دکھائی ہے۔ اور اندازہ ہے کہ یہ دوسروں پر بیتی ہوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ خود آپ پر گزری ہوئی کیفیت ہے، فرماتے ہیں۔

’’حقیقت یہ ہے کہ حضرت اقدس کے آسمان عروج کی کسی کو خبر نہیں ہوئی، زبانی ارشادات میں وہ بہت سی باتیں آپ نہ پائیں گے، جو عموماً ملفوظات میں جمع کی جاتی ہیں۔ الفاظ وتعبیرات سے حضور والا کو طبعاً نفرت تھی، جس پر ایک نظر حضور کی ہوگئی، وہ اس راز سے واقف ہو جاتا تھا حضور کا جسد اقدس سراپا نور آفتاب یا خزانہ برق ہے، ایک ہلکی سی نگاہ پڑی اور رگ وریشہ سے اذکار کے نعرہ سے فضاء سامعہ معمور ہوگئی۔

سرمستی و بے خودی جس طرح حضور پر ہر لمحہ طاری رہتی تھی، حلقہ میں بھی اس کا خاص اثر پیدا ہوتا تھا، حضور کی نگاہ اور ایک لمحہ کی صحبت خطرات فاسدہ کو یک لخت دور فرماتی تھی۔ (مکاتیب ریاضیہ۔ ص ۱۰۰)

بہار کے مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا بشارت کریم صاحب، نور اللہ مرقدہ کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد ادریس صاحب ذکا علیہ رحمہ بہت پاک نفس اور متواضع بزرگ تھے، متعدد باران کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ وہ حضرت مولانا کے شاگرد تھے، اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

’’غالباً ایام شباب ہی سے مولانا اس وادی (سلوک وطریقت) کے بھی شہ سوار

تھے پہلے حضرت شاہ نعمت اللہ علیہ الرحمہ بیعت ہوئے، مدتوں آپ کی مبارک صحبتوں میں رہے اور خلعت خلافت سے سرفراز ہوئے۔ فرماتے تھے کہ جب میں اپنے پیر کی خدمت میں خانقاہ میں جاتا تو وہاں خوشی کی لہر دوڑ جاتی، حضرت سے لے کر صاحبزادگان اور حاضر باشان خانقاہ تک سبھی خوش ہوجاتے۔ (مکاتیب ریاضیہ، ص۸۳)

مولانا محمد ادریس صاحب نے ''پہلے'' اسلئے لکھا کہ جب ۱۳۴۸ھ میں شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا، تو باوجود شیخ کامل ہونے کے ذوق طلب ان کو حضرت مولانا بشارت کریم صاحب نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں لے گیا۔ اور وہاں سے بھی فیوض و برکات حاصل کئے۔ خود بینی اور حبِّ جاہ کا رَذیلہ جب دل سے نکل جاتا ہے، تو آدمی حق تعالیٰ کی طلب میں کہیں جانے سے عار نہیں محسوس کرتا۔

مولانا بشارت کریم صاحب کی خدمت میں :

حضرت مولانا بشارت کریم صاحب، قدس سرہ بڑی شان کے بزرگ تھے، بہار کے اجلۂ مشائخ میں ان کا شمار تھا، اللہ نے دین حنیف کی بہت خدمت ان سے لی، علماء وصلحاء کی کثیر تعداد ان سے مستفید ہوئی۔ حضر شاہ نعمت اللہ صاحب کی وفات کے چار پانچ برس بعد حضرت مولانا ریاض احمد صاحب آپ کی خدمت میں گڑہول پہونچے، اس پہنچنے کے چشم دید شاہد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب ذکا علیہ الرحمہ ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''حضرت مولانا ریاض احمد صاحب اپنے شیخ کے انتقال کے بعد اپنی پیاس بجھانے کے لئے پھر کسی چشمۂ فیض کے متلاشی ہوئے، غالباً ۱۹۳۳ء میں میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ بڑی اور گھنی داڑھی، خوش قامت، دہرا بدن، سر پر عمامہ، کھادی کا بڑا کرتا بدن میں صدری، سادہ لباس میں ملبوس، وضع قطع سے متقدمین علماء کی یادگار بیل گاڑی سے اترے، اور ہمارے دروازہ پر فروکش ہوئے، والد بزرگوار حضرت اقدس مولانا بشارت کریم رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اگرچہ خانقاہ نام کی کوئی چیز نہ تھی، لیکن معنی آپ کا

دروازہ خانقاہ کا حکم رکھتا تھا، ہر وقت اللہ والوں کا اجتماع رہتا، ہمہ دم طالبین خدا کے آنے جانے کے سلسلہ لگا رہتا، غرض مولانا بھی ان ہی واردین میں سے ایک ہوئے، پھر حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اب دونوں بزرگوں میں کیا باتیں ہوئیں، مجھے اس کی کیا خبر ہوتی۔ بہر حال مولانا تشریف لائے، اور ایک دو روز قیام کر کے چلے گئے۔ اب مولانا کی تشریف آوری کا دروازہ کھل گیا۔ اور آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا، علماء تو آتے ہی جاتے رہتے، مگر حضرت اقدس نے بارہا مولانا محترم کا تذکرہ جس انداز میں فرمایا تھا، اس سے ہم لوگوں کے دلوں پر یہ تاثر ہوا کہ مولانا بڑے پختہ اور جید عالم ہیں۔ (مکاتیب ریاضیہ۔ ص۷۵/۷۶)

اوصاف و کمالات : حضرت مولانا ریاض احمد صاحب علیہ الرحمہ کن خوبیوں کے حامل تھے اس کا کچھ اندازہ سابقہ سطور سے ہو چکا ہے، تاہم کچھ امور بطور خاص قابل لحاظ ہیں۔ اور انھیں تحریر کر دینا مناسب ہے۔

حضرت مولانا ایک باکمال مدرس تھے، اور اپنے طلبہ پر بے حد شفیق تھے، ہر ممکن طریقے پر انھیں علم وفن سے نوازا چاہتے تھے، بعض واقعات وحالات تو اتنے حیرت انگیز ہیں، کہ یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ حضرت زمانۂ سابق کے علماء میں ہیں، اس سلسلے میں چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

حضرت مولانا کے شاگرد عزیز اور خلیفہ اکبر حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب، امیر شریعت خامس علیہ الرحمہ لکھتے ہیں۔

اور ۱۹۲۱ء/۱۹۲۲ء کی بات ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ چند گھنٹے صبح کو مطب کرتے، اس کے بعد مدرسہ میں ہم لوگوں کو درس دیا کرتے تھے، میں اس زمانہ میں شرح جامی حضرت ہی سے پڑھ رہا تھا، حضرت مریضوں کو دیکھنے کے لئے باہر بھی جاتے تھے، ایک بار مجھے ساتھ لے کر ایک مریض کو دیکھنے دیہات میں تشریف لے گئے، راستہ بھر ٹمٹم پر مجھے دیہاتوں کی

تمام جڑی بوٹیوں کے عربی نام یاد کراتے جاتے تھے، یہ ذوق تدریس اور لگن تعلیم کی تھی کہ راستہ بھر لغات عرب یاد کراتے رہے، گویا سفر میں بھی درس جاری رہتا، (مکاتیب ریاضیہ، ص:۱۷)

اور ۱۹۲۶ء میں پھر دوبارہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو مدرسہ حمیدیہ گودنا ضلع سارن میں درس وتدریس کے لئے بلا گیا تھا، ہم لوگوں کو حضرت نے رام پور سے خط لکھ کر بلالیا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ہم لوگوں پر جتنے احسانات ہیں ان میں سے ایک یہ بھی کرم فرمائی ہے کہ اس سال کے اخیر میں یا ۱۹۲۷ء کے ابتداء میں حضرت مولانا نے مجھے اور میرے رفیق قدیم مولانا سید محمد شافق رحمۃ اللہ علیہ کو آستانہ عالیہ اندروا عباداللہ لے جا کر حضرت میاں قدس سرہ سے بیعت کرادی منطق وفلسفہ کی فضول موشگافی کے زہر فاسد نے میرے خیالات واسلامی مسلمات میں شکوک وشبہات کے شیطانی وساوس وفاسد خیالات کی آویزش کھڑی کردی تھی، اللہ ارحم الراحمین، تیری قدرت کا کرشمہ! میاں رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک سے جیسے ہی ہاتھ بیعت کے لئے ملایا، ایک خاص کیفیت سی معلوم ہوئی، اور وہ تمام خیالات فاسدہ هباءً منثوراً ہوگئے اے ارحم الراحمین تیرا ہزار شکر! وہ شکوک پھر نہ آئے **فالحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات.** یہ بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نوازش تھی کہ اس ورطہ سے نکالا۔ (ص:۱۹)

ایک عجیب مخلصانہ جذبہ اور عمل : یہ واقعہ جو ابھی آپ نے پڑھا، یہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب امیر شریعت خامس علیہ الرحمہ سے تعلق رکھتا ہے، اب اس سے بھی عجیب تر قصہ اور جذبہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب علیہ الرحمہ کے قلم سے معلوم ہو چکا ہے کہ مولانا موصوف بہار کے مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کے فرزند گرامی تھے، حضرت مولانا قدس سرہ کا جب انتقال ہوا تو یہ اور ان کے بڑے بھائی مولانا محمد ایوب صاحب تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور خود اپنے والد سے پڑھ رہے تھے اب ان صاحبزادوں کی تعلیم کا مسئلہ تھا۔ باقی داستان مولانا محمد ادریس

صاحب سے ہی سنئے۔

اور ۱۹۳۵ء میں جب حضرت اقدس کا وصال ہوگیا۔ تو اب حضرت اقدس کے متوسلین کو ہم لوگوں کی تعلیم کے بارے میں فکر دامن گیر ہوئی، ہم لوگ اپنی ناسمجھی یا بچپن اور ناتجربہ کاری کی بنا پر یا جس وجہ سے بھی ہو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب حضرت اقدس کی طرح پڑھانے والا ہندوستان میں ہوگا کون؟ اس لئے مخلصین جن کا بھی نام لیتے، ہم لوگ ان سے پڑھنے پر راضی نہ ہوتے، آخر بڑے غور وفکر کے بعد ہم لوگوں نے طے کیا کہ اب اگر ہماری تعلیم ہوسکتی ہے تو صرف ایک استاذ یعنی مولانا ریاض احمد صاحب سے ہوسکتی ہے، کیونکہ حضرت اقدس سے بارہا آپ کی تعریف سن چکے تھے، مولانا ان دنوں مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں سینیئر مدرس تھے، اب متوسلین حضرت اقدس آپ کے پاس تشریف لے گئے، اور سارے حالات سے باخبر کیا، مولانا نے غایت شفقت کی بناء پر مدرسہ سے فرصت لی اور ہم لوگوں کی تعلیم کے لئے گڑھول تشریف لائے۔ (مکاتیب ریاضیہ، ص: ۷۶/۷۷)

گڑھول حضرت اقدس مولانا بشارت کریم صاحب کا وطن ہے، یہاں آپ ماہ دو ماہ نہیں کامل دوسال تک مقیم رہ کر حضرت کے دوصاحبزادوں مولانا محمد ایوب صاحب اور مولانا محمد ادریس صاحب کو پڑھاتے رہے، کتنی بڑی قربانی اور کیسا ایثار تھا۔

دوسال کے بعد مدرسہ عزیزیہ کے ارباب حل وعقد نے خط لکھا کہ آپ یا تو مدرسہ آئیں یا استعفا دیدیں۔ اب یہ ایک کشمکش کا مرحلہ تھا۔ عزیز شاگردوں نے عرض کیا کہ آپ استعفا نہ دیں۔ لیکن پھر ان کی تعلیم کا کیا ہوگا۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ یہ دونوں بھی ساتھ جائیں۔

مولانا کا کمال تھا کہ مدرسہ کے اسباق بھی پڑھاتے اور ان دونوں صاحبزادوں کو بھی تعلیم دیتے۔ پھر یہ سلسلہ بھی دوسال تک قائم رہا۔

بہرحال حضرت مولانا نے حق محبت اور حق خدمت کی ادائیگی کی ایک نادر مثال قائم کردی۔

ذوق عبادت اور استقامت: تدریس وتعلیم کے شوق کے ساتھ حضرت مولانا کو حق تعالیٰ کی عبادت کا بھی ذوق بہت تھا اور اس باب میں بھی بڑی استقامت حاصل تھی، مولانا محمد ادریس صاحبؒ فرماتے ہیں کہ۔

ہم کو سالہا سال تک مولانا کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، مولانا کی شب بیداری اور عبادت گزاری کو دیکھ کر حیرت ہوتی کہ ایک ضعیف العمر انسان، اللہ کی بندگی میں کیسا جوان ہو جاتا ہے۔

ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم ص ۸۴

مولانا محمد ادریس صاحب کے بیان کے مطابق، مولانا مغرب کے بعد اوابین کی پابندی سنت مؤکدہ کے مثل کرتے۔ دلائل الخیرات، اور حزب البحر کے پڑھنے کا روزانہ معمول تھا، دیکھنے والوں کی عینی شہادت ہے کہ برسوں نماز تہجد قضا نہیں ہوئی۔ بالالتزام روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے۔

جلسوں کے ہنگامہ میں جب کہ جلسہ دیر تک چلتا، لوگ دیر میں سوتے، اور فجر کی نماز بھی خطرہ میں پڑ جاتی، مولانا اس ہنگامہ میں بھی تہجد اور تلاوت سے غافل نہ ہوتے جامع العلوم مظفر پور کے صدر مدرس حضرت مولانا جمیل احمد صاحب کی روایت مولانا محمد ادریس صاحب نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کہیں جلسہ میں یہ دونوں بزرگ مدعو تھے مولانا جمیل احمد صاحب فرماتے ہیں کہ میری ٹرین بہت لیٹ ہوگئی، میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو رات کے دو بج چکے تھے، جلسہ ختم ہو چکا تھا، لوگ سو رہے تھے۔ ساری فضا پر نیند کا سناٹا طاری تھا۔ مگر اللہ کا ایک بندہ موم بتی جلا کر تلاوت قرآن میں مصروف تھا، جس کی دھیمی دھیمی آواز پر کیف اور مترنم ہو رہی تھی، غور سے دیکھا تو وہ مولانا ریاض احمد صاحب تھے ایک مرتبہ مولانا ریاض احمد صاحب نے بر سبیل تذکرہ فرمایا ۱۵/ سال تک میں نے سورج کو نکلتے نہیں دیکھا (کیونکہ نماز

فجر کے بعد سے طلوع آفتاب کے بعد تک آپ مراقبہ اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے) ایک دن اتفاق سے جب آفتاب نکلتے دیکھا تو بالکل نئی چیز معلوم ہوئی۔

تواضع و تاثیر: علم و فضل اور صلاح و تقوی کے اتنے رتبۂ بلند کے باوجود آپ کی تواضع و فنائیت اور دید قصور کا یہ عالم تھا، کہ اپنے اندر انھیں کوئی وصف کمال محسوس نہ ہوتا تھا۔ اور آپ کے قول و عمل اور حال سے بھی ہمیشہ یہی ظاہر ہوتا تھا کہ گویا آپ کچھ نہیں ہیں۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ ایک واقعہ سناتے ہیں کہ حضرت سے وابستہ ایک شخص نے اپنی پریشانی و روحانی خستگی سے تنگ آکر ایک مرتبہ لکھا کہ حضرت! آپ کا یہ ناکارہ، ناکارہ ہی رہ جائے گا، نظر عنایت فرما کر دستگیری فرمائی جائے۔

شاہاں چہ عجب! گر بہ نوازند گدارا

اس کے جواب میں دید قصور و کسر نفسی کے غلبہ میں تحریر فرمایا کہ میں نے بتیس سال حضرت میاں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں حاضری دی مجھے کیا ملا جو تجھے دوں؟

نظر بظاہر تو یہ ایک ٹکا سا اور کھرا جواب ہے۔ مگر اس کے پڑھتے ہی صاحب واقعہ کے بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہوا، اور دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی، اور سارا جسم اس سے اس طرح متاثر ہوا کہ مسجد تک جانا دشوار ہوگیا، حالانکہ وہ صرف چند قدم کے فاصلہ پر تھی، ہر آن یہ احساس ہوتا تھا کہ اب گرا تب گرا، پھر تو وہ حال ہوا کہ اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔

سالک کا حال: حضرت مولانا ریاض احمد صاحب علیہ الرحمہ راہ طریقت کے سالک کا حال بیان کرتے ہوئے تلسی داس کا یہ شعر پڑھتے تھے اور اس کی تشریح فرماتے۔

یورئن پات جل بیچ اگے = جل ہی میں کرے پسار ہو
پر جل سے ہے اتنا بیر کہ = ڈھل جات جیسے پارہ ہو

فرماتے کہ جس طرح یورئن کا پتہ پانی میں پرورش پاتا ہے، اور پانی ہی میں رہتا

ہے، اور اگر پانی سے نکال دیا جائے تو سوکھ جاتا ہے، باوجود ان باتوں کے پانی سے اس کا تعلق محض خارجی ہی ہے، کیونکہ وہ پانی کو پارہ کی طرح پھینک دیتا ہے، اس کو جذب نہیں کرتا، اسی طرح سالک بھی ظاہری طور پر دنیاداری میں الجھا نظر آتا ہے، مگر باطنی طور پر اس کا تعلق کسی اور ہی سے ہوتا ہے۔

فنا درکار ھے: حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کے مرید خاص جناب حاجی وکیل احمد صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ سنت پور میں کبیر داس کا ایک دوہہ پڑھ کر اس کی تشریح اس انداز میں فرمائی کہ سامعین پر رقت طاری ہوگئی۔

کبیر داس لکھتے ہیں۔

موٹی مایا سب تجیں، جھینی تجی نہ جائے پیر پیمبر اولیاء، جھینی سب کو کھائے
جھینی مایا جن تجی موٹی گئی برائے ایسے جن کے نکٹ سے سب دکھ گئے بلائے

مولانا نے فرمایا کہ بعض لوگ گھر بار، دھن دولت اور بال بچوں سے رشتہ منقطع کر کے جنگل اور خانقاہ آباد کرتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کو دنیاداری سے کوئی لگاؤ نہیں، لیکن انھیں جھینی یعنی باریک مایا یہ خیال دلاتی ہے کہ میں بھی بڑے بڑے اولیاء اللہ اور سنتوں کی طرح مشہور ہوجاؤں، کبیر کہتے ہیں کہ یہی باریک مایا سب کو کھا گئی، اس لئے باریک مایا کو ترک کرو، یعنی خود کو فنا کرو، اگر خود کو فنا کردو تو یہ موٹی مایا کچھ نہ کر پائے گی۔

(مکاتیب ریاضیہ، ص:۵۳)

واقعی سالکین کے لئے یہ بڑا مہلکہ ہے، وہ عبادت ریاضت سب کچھ کرتے ہیں، ظاہری اور موٹی موٹی خواہشات فنا کردیتے ہیں، مگر دل میں ایک چور جب جاہ اور خواہش شہرت کا بیٹھا رہتا ہے، اور یہ چور سب عبادت وریاضت کو کھا جاتا ہے۔ اس لئے سالک کو اندر کے اس چور سے بہت ہوشیار رہنا چاہئے، آدمی کی سب طاعت وبندگی اسی محور پر گھومنے لگتی ہے کہ لوگوں میں اس کی وقعت ہو، محبت ہو، شہرت ہو، ظاہر ہے کہ یہ خدا پرستی نہیں، خواہش

پرستی ہے اندر کی اس خواہش کو مٹانا چاہئے، مگر یہ ہے مشکل کام! تاہم بہت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاء رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَداً** (سورہ کہف/۱۱۰) جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا یقین رکھتا ہو اسے چاہئے کہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اس آیت میں شرک کی تفسیر ’’ریا کاری‘‘ سے کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ آدمی نے جب اپنے رب کی عبادت اس طرح کی کہ اس کے نتیجے میں وہ شہرت اور وقعت کا طالب ہوا۔ تو اس نے خالص اپنے رب کے لئے عبادت نہیں کی۔ اس نے درحقیقت مخلوق پرستی کی۔
اعاذنا الله منها۔

* * * * *

مکاتیب ریاضیہ

مکاتیب ریاضیہ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کے کچھ مکاتیب کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اپنے شاگردوں اور بعض متوسلین کے نام لکھتے ہیں۔ حضرت مولانا جہاں بہت بڑے عالم، بہت بڑے سالک، بہت بڑے مرشد تھے، وہیں اعلیٰ درجہ کے ادیب بھی تھے، ان مکاتیب میں تصوف وروحانیت اور ادب وانشاء کو اس طرح بہم کیا گیا ہے کہ دونوں طرح کے اصحاب فن ان سے محظوظ ہوں۔ فارسی زبان میں اس طرح کے مکتوبات تو متعدد ہیں، مثلاً حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کے مکتوبات صدی، حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات، اور حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کے مکتوبات لیکن اردو زبان میں اس طرح کا پہلا مجموعہ نظر سے گزرا ہے۔

ان مکاتیب کے مطالعہ سے جہاں اہل دل حضرات پر سلوک اور طریقت کی راہیں روشن ہوتی ہیں، وہیں اہل زبان مولانا کی بلاغت اور منفرد اسلوب پر عش عش کرتے ہیں۔ اردو زبان میں مکاتیب تو بہت سے شائع ہوئے ہیں، خالص مذہبی بھی اور خالص ادیبانہ بھی

اور کچھ ایسے بھی جن میں دونوں کی چاشنی ملتی ہے، لیکن مولانا کے مکاتیب کا انداز ہی نرالا ہے، ان کا قدرے انتخاب پیش کرتا ہوں۔

یہ خطوط ''مکاتیب ریاضیہ'' کے نام سے ظفر کمالی صاحب نے مرتب کئے ہیں اور اسے انجمن فلاح اردو رانی پور بڑہریا ضلع سیوان نے شائع کیا ہے، اس مجموعہ میں متعدد حضرات کے مضامین بھی ہیں جن میں حضرت مولانا کی شخصیت کا تعارف کرایا گیا ہے، لیکن یہ مکاتیب جس توجہ اور اہتمام کے مستحق ہیں وہ اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی ہیں طباعت بھی ناصاف ہے، فروری ۱۹۸۶ء میں اس کی اشاعت ہوئی دوبارہ شاید اشاعت کی نوبت نہیں آئی، کاش کوئی ادارہ اس پر توجہ کرتا یہ بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔

ان میں زیادہ تر خطوط مولانا نے اپنے ایک خاص مسترشد مولوی حاجی وکیل احمد صاحب سیوانی کے نام لکھے ہیں جو پہلے ان کے شیخ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ سے بیعت تھے۔ شیخ کے انتقال کے بعد مولانا کی طرف رجوع ہوئے، تھوڑے سے مکاتیب دوسرے حضرات کے نام بھی ہیں، ہم جستہ جستہ اقتباسات مختلف عنوانوں کے تحت نقل کر رہے ہیں۔

جمعیت باطن : حضرات مشائخ کے یہاں قلب کو انتشار خیال سے بچا کر یکسوئی کی راہ پر ڈالنا، روحانی ترقیات کے لئے ضروری ہے، اس کے بغیر وہ بات نہیں پیدا ہوسکتی جس کو حدیث میں ''احسان'' فرمایا گیا کہ آدمی خدا کی عبادت اس طرح کرے جیسے وہ اس کو دیکھ رہا ہے، اس کیفیت کا حصول یکسوئی خیال کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی یکسوئی خیال کی صوفیانہ تعبیر ''جمعیت باطن'' ہے۔ مولانا اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''عقائد صحیح اور اعمال صالحہ و اخلاق فاضلہ کے بعد جس چیز کی بڑی ضرورت ہے اس کو ''جمعیت باطن'' کہتے ہیں، اس کے حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں، ہمارے مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کا دستور چلا آرہا ہے کہ چوبیس گھنٹہ قلب کی نگرانی، فارغ

> الحال طالب کے لئے لازم وضروری قرار دیتے ہیں، اسم ذات کی کثرت، اغیار سے نفرت، فکر ومراقبہ شرط راہ ہے، تلاوت قرآن ازدیادِ نورانیت کا قوی سبب اور محرک ہے، صرف تمنا وحسرت سے کشود کار ناممکن ہے، محض کتب بینی مشعل راہ نہیں ہوسکتی، اسم ذات کی مداومت اس قدر کرنی چاہئے کہ نور ذکر قلب وسر میں سرایت کر جائے، مرشد حقیقی وہادی حقیقی خدائے قدوس ہے، وہ ہرلمحہ ترقی دینے کے لئے تیار ہے، صبر وصلوٰۃ والوں کے لئے ہی کامیابی مقدر ہے، صبر کے معنی ہیں جب تک کامیابی نہ ہو مصائب راہ وشدائد کا مقابلہ کرنا اور سعی اور جدوجہد کا قائم رکھنا، (ص:۱۱۳)

سلوک کا راستہ: راہ سلوک کیا ہے، اوراس کے طے کرنے کا انداز کیا ہونا چاہئے، اوراس کے لئے کس سامان اور کس تیاری کی ضرورت ہے؟ مولانا کے الفاظ میں سنئے! فرماتے ہیں:

> ''وہ سلوک کا راستہ سکون کے ساتھ گھاٹیوں کو طے کرنے اور چپکے چپکے قلعہ پر قبضہ کرنے کا نام ہے، استعینوا بالروحة والغدوة وشئ من الدلجة، مغرب کے وقت سے چاشت تک صف آرائی کرنی ہے، کبھی ذکر ہے، کبھی تلاوت ہے، کبھی آہ وبکا ہے، کبھی فکر ومراقبہ ہے۔ دوگھڑی دن کے بعد دنیاوالوں کے ساتھ کام میں لگ جانا چاہئے۔
>
> نفس کی شرارت کو کچلنے کے لئے روزہ وغیرہ تریاق پاس میں رہنا چاہئے، کھانا پینا بقدر ضرورت ہونا چاہئے، جس طرح دوا بقدر ضرورت استعمال کی جاتی ہے، ذکر وفکر مراقبہ کی کثرت ہونی چاہئے، جس طرح غذا کی کثرت کی جاتی ہے، خاک میں ملنا، اپنے کونیست ونابود کرنا اس زمین کی یہی تخم پاشی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔
>
> انشاء اللہ اندروا کے سفر روحانی میں آپ کے قافلہ عزم وارادہ سے ملاقات ہوگی، اب سچے کھیل کے لئے تیار ہوجائیے۔ (ص:۱۱۵)

حوصلہ اور اعتماد علی اللّٰہ : سالک راہ طریقت کو ہمیشہ ہمت عالی رکھنی چاہئے اور جس قدر اللہ پر اعتماد اور توکل ہوگا، اور اپنے نفس کی نفی ہوگی، حوصلہ اتنا ہی بلند ہوگا اور انسان کو اس کے بعد کتنا عروج حاصل ہوگا، اس کی خبر شاید کراماً کاتبین کو بھی نہ ہو، مولانا کا البیلا انداز ملاحظہ ہو:

''عشق مولیٰ کے طالب کو، عشق لیلیٰ کے طالب و مدعی سے کم نہیں ہونا چاہئے، جان و مال نثار راہ محبوب کرنا عین قصور اور عجز کا اعتراف کرنا ہے۔ ؎

ہر کس کہ ذلیل کرد خود را   اندر نظرش ہموں خلیل است

روح و قلب و سر میں ذکر حق کا شعلہ بلند ہونا چاہئے، عشق اختیاری ہے کہ اضطراری، یہ سوال عقل نا تراشیدہ کی پیداوار ہے۔ مالک الملک والملکوت کے نزدیک سب چیزیں یکساں ہیں، اپنے بل بوتے پر کچھ نہیں ہوسکتا، اسی کے بھروسہ اس تک پہونچنا ہے، إلیٰ ربک المنتهیٰ۔ وضو اور مسواک پر مداومت رکھئے، ہمیشہ باطہارت رہنا بہت کچھ مثمر انوار و برکات ہے۔ ذات احدیت کا مراقبہ لازم رکھنا چاہئے، اس کی معیت وقرب مجہول الکنہ ہے، آپ کا کام صرف طلب ہے، اندریں رہ می تراش و می خراش، اتباع سنت مصطفویہ کو اپنا شعار بنانا چاہئے۔

ہر کہ در راہِ محمد رہ نیافت   تا ابد گردے ازیں درگہ نیافت

ماہِ صیام کے برکات سے مستفید ہونے کے لئے اپنے کو تیار کیجئے، پہلی شب رمضان سے لیلۃ القدر کا احتمال ہے، ہر شب اسی اندیشہ میں گزاریئے کہ شاید یہی شب، شب وصل ہے، اللہ اکبر۔ (ص:۱۱۷)

تصوف کا حاصل : تصوف کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے، اس کو سب نے اپنے اپنے طرز پر بیان کیا ہے، مولانا سے اس کا بیان سنئے، فرمایا:

''تصوف کا نام جب سے مسلمانوں میں رائج ہوا، اس کے معنی سمجھنے میں فاش غلطی

> ہوئی، اس کا حاصل یہ ہے کہ عقائد و اعمال کی اصلاح کے ساتھ اخلاق اور قلبی جذبات کی اصلاح کی جائے، اور کثرت خیال کو کھینچ کر وحدت کے راستے پر لگایا جائے، ماسوا سے علاقہ کو توڑ کر ایک ذات سے وابستہ کیا جائے، اتنا کرنا اپنا فعل اختیاری ہے، اس کے بعد جلد یا بدیر کامیاب ہونا صرف وہبی چیز ہے، جس کا عمل مقبول ہو جائے! جس پر فضل ربانی ہو جائے! شیخ یا مرشد فیض کا واسطہ ہے، اس کو ایک رتی بھر اختیار نہیں کہ امور غیبیہ میں تصرف کر سکے، رہا صحبت کا اثر تو یہ ایک مسلّمہ چیز ہے، اس کے لئے طالب میں جس قدر اخلاص ہوگا، جتنی سچی طلب ہوگی، اتنا ہی فیضیاب ہوگا۔ (ص:۱۱۹)

مولانا کی یہ عبارت دریا بکوزہ کی مصداق ہے، مختصر اشارات میں تصوف کی حقیقت کو واضح کر دیا، اور ایسی تشریح کی جس پر کوئی معاند بھی اشکال نہ کرے، پھر تصوف کے اندر اختیاری اور وہبی کے درمیان خط امتیاز بھی کھینچ دیا، اور واضح کر دیا کہ جو چیز اختیاری ہے وہ عین مطلوب ہے، اور جو وہبی ہے، اس پر کسی کو کیا مجال اعتراض؟ پھر تصوف میں شیخ و مرشد کی حیثیت اور ضرورت دونوں کو واضح کر دیا، غلط اندیشوں نے پیروں کو جو خدائی درجہ دے رکھا ہے اس کی بھی جڑ کاٹ دی، اور جو انھیں ایک فضول اور بے ضرورت چیز سمجھتے ہیں انھیں بھی سمجھا دیا کہ فیض مرشد ہی کے واسطے سے آتا ہے، اور اخیر میں شیخ کی ضرورت کو بدیہی بتا کر سب قیل و قال کا دروازہ بند کر دیا، اور اصل چیز اخلاص اور سچی طلب کو بھی ظاہر فرما دیا۔

پہلے خودی کو آگ لگاؤ: سالک راہ طریقت کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ اس کا اپنا نفس ہے، نفس کی خواہشات اور اس کے تقاضے اسے دم نہیں لینے دیتے، ایک کے بعد ایک فانی لذتیں، جھوٹی حلاوتیں، غلط تقاضے، اس کا نفس پیش کرتا ہے اور آدمی اسی میں الجھ کر اللہ تعالیٰ سے غافل رہ جاتا ہے، آدمی اپنے نفس سے چھٹکارا حاصل

کرلے تو خدا تک پہونچنے میں دیر نہیں لگتی

تو خود حجاب خودی حافظؔ از میاں برخیز

حافظ تم خود اپنے آپ حجاب ہو، تم ہی درمیان سے نکل سے جاؤ، پس اللہ تک پہونچ جاؤ گے۔

مولانا کا ارشاد ملاحظہ ہو:

> ”بھائی ہم نے بہت سمجھایا کہ حتی الوسع تعلقات منقطع یا خفیف کرو، تمہارے اندر جلانے کے لئے خود آگ موجود ہے، پریشان کیوں ہوتے ہو، انھیں سوختہ جان و مال ہونا ہی پسند ہے، شریعت کی متوسط راہ سے ترقی کر کے مقربین اور ابرار تک چلنا ہے تو دیا سلائی لاؤ، سب سے پہلے خودی میں آگ لگاؤ، پھر خدائی کو پھونک دو، تنہا اور یکہ خدا ہی رہ جائے، اب تم کہاں گئے؟ تم بھی ماسوا کے ساتھ خاکستر ہو گئے ....
>
> جس قدر جھوٹے خدا تختے پر رُونما ہیں، سب کو نیست و نابود کرو، جب صفائی ہو جائے تو جلوہ نمائی نظر آئے، اس کے بغیر محض لفاظی ہے۔ (ص: ۱۲۱)

جوانی کے خطرات: ایک بندہ مومن جب اللہ کی راہ میں چلتا ہے، تو شیطان اس پر چوطرفہ حملہ کرتا ہے، بالخصوص سالک جب نوجوان ہوتا ہے تو اس پر حملہ زیادہ کرتا ہے، ایسا ہی ایک نکتہ ارشاد فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”آپ کا دامن خطراتِ نفس سے آلودہ ہو رہا ہے، ہر وہ مبتدی جو شباب میں اس راستہ میں قدم رکھتا ہے، اس کے پیچھے شیطان بری طرح پڑتا ہے، اس سے بچنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہئے، جس کی اہلیہ نہ ہو، وہ بااہل ہو جائے، جس کو استطاعت نہ ہو وہ صوم داؤد علیہ السلام پر عامل ہو جائے، نظر، تکلم، خلوت، اجنبیات سے خلط ملط سب سے قطعاً احتراز کرے، اگر ناممکن ہو تو تبدیل و انتقال مکان کر لے......
>
> افسوس انسان کتنے موذیوں کے پنجے میں گرفتار ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عصمت کی چادر میں چھپا لے، اور نفس و شیطان کے نرغے سے نجات دے۔

> عزیزمن! پیشۂ معلّمی نہایت ہلاکت خیز کوچہ ہے، کتنے گھر اس ڈاکو نے لوٹ لئے، ہمت مضبوط تر چاہیئے، یہ ابھی پہلا محاذ جنگ ہے، شہنشاہیٔ قلب تک پہونچنے میں نفس وشیطان کیا کیا فساد برپا کریں گے، توبہ واستغفار پر مداومت رکھو، لاحول اکثر پڑھا کرو، جاسوس نظر پر کتاب اللہ کا پہرہ بٹھاؤ، خدا توفیق رفیق شامل حال کرے۔ آمین (ص: ۱۲۵)

یہ اقتباس جس انسانی کمزوری پر متنبہ کرتا ہے اوراس سے بچنے کی جو تدبیر بتا تا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا مکائد نفس اور اغوائے شیطان کو کس قدر پہچانتے تھے، اوراس سے بچنے کی تدبیر کیسی عمدہ بتاتے تھے، اور یہ پورا اقتباس بلاغت کی جان ہے، ’’جاسوس نظر پر کتاب اللہ کا پہرہ بٹھاؤ‘‘ **قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ** (اہل ایمان سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں) اور **يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ** (وہ آنکھوں کی چوری کو بھی جانتا ہے، اور جو کچھ دل میں چھپا ہوا ہے اسے بھی جانتا ہے) ان دونوں آیتوں کی تعمیل حکم کا کتنا خوبصورت پیرایہ ہے۔

صحبت ناجنس : سالک راہ طریقت جب قدم بڑھاتا ہے، تو اس کو قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، انسان کا ایک دشمن تو اس کی ذات سے باہر ہے وہ شیطان ہے، یہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے، کہ سالک رک جائے، نہ رکے تو پھسل کر گر جائے۔ دوسرا دشمن اس کی ذات کے اندر ہے، یہ نفس ہے، شیطان اسی کو اپنا مددگار بناتا ہے، نفس انسانی لذات وشہوات کا شیدائی ہے، یہ سانپ سالک کو اندر ہی اندر اس طرح ڈستا ہے کہ اس کی روح ایمانی برباد ہوجاتی ہے، اور بسا اوقات اسے احساس نہیں ہوتا۔ مولانا کا ایک مکتوب ملاحظہ ہو:

> ’’عزیزمن! جو مرض تم نے لکھا ہے وہ نہایت مہلک مرض ہے، معاصی وانوار الٰہی ایک قلب میں مجتمع نہیں ہوسکتے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تم نے سنا ہوگا، زلیخا کے

> خیالات فاسدہ سے عاجز ہوکر باوجود زبردست فطرت سلیمہ رکھنے کے بلبلا کر دعا کرتے ہیں: رَبِّ السِّجۡنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدۡعُونَنِيٓ إِلَيۡهِ ، خداوند! فسق وفجور کی تباہ کاریوں سے قید خانہ میں سڑنا مجھے پسند ہے، بہرحال جس طرح بارود کو دیا سلائی سے خطرہ ہے، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ طالب کو صحبت ناجنس سے احتراز کرنا چاہئے، شیطان کی مکر بازی سے نہیں کھیلنا چاہئے، اگر ذرا بھی اس کا خطرہ ہو تو اس میں زمین و آسمان سے دور ہو جانا چاہئے۔
>
> ہر تین ماہ پر گھر جایا کرو، مرد مجرد پر شیطان گولہ باری کرتا رہتا ہے، روزہ بکثرت رکھنا اس کا علاج ہے، صالحہ بی بی اس قسم کی آفات کے لئے مضبوط قلعہ کا کام دیتی ہے، قلب میں آتش شوق الٰہی تیز کرنے کے لئے حبس نفس کے ساتھ معمولی جہر کے ساتھ ذکر لا الہ الا اللہ پانچ سو مرتبہ روزانہ عمل میں رکھئے۔ (ص:۱۲۳)

سالک کی تمنا اور شرطِ کامیابی: مخلص طالب جب راہِ مولیٰ میں چلتا ہے تو اسے عجلت ہوتی ہے کہ جلد یہ راہ طے ہو، اور وہ جلد اللہ تک پہونچے، اس میں دیر لگتی ہے، تو اس کے دل میں طرح طرح کی تمنائیں سر اٹھاتی ہیں، گونا گوں وساوس اسے گھیرتے ہیں، اس حال میں کبھی کبھی وہ مایوسی کا شکار ہوتا ہے، اسی طرح کے مشکلات میں گرفتار ایک سالک کو مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ’’آپ کے خط کے مضامین سے وعظ و پند کے مضمون کو حذف کرنے کے بعد صرف یہی باقی رہ جاتا ہے کہ آپ کی خواہش ہے اور تھی کہ کوئی ایسا قدرتی سیلاب آتا جس سے تمام خس وخاشاک آپ کے صحن دل اور حریم قلب سے دور ہو جاتے، اور آپ کا قلب مجلّٰی و مصفّٰی ہو جاتا، واقعی یہ خواہش کوئی بے جا خواہش نہیں ہے، ہر طرح ستودہ و محبوب خواہش ہے، مگر عزیز من! آپ جانتے ہیں کہ آپ کی خواہش کے تابع قادر و مدبر عالم کی رضا و خواہش نہیں ہو سکتی، آپ کو اس کے تابع ہونا چاہئے، آپ کا وظیفہ

ترکِ ارادہ ہے، جس روز آپ اس منزل پر پہونچیں گے، اس روز آپ پر "فتح باب" ہوگا، میں ایک ناچیز و نااہل انسان ہوں، آپ نے غلطی سے مجھے اپنا مرکز توجہ بنا رکھا ہے، مجھے اپنی حقیقت معلوم ہے، اپنے ضعف و عجز اور جہالت کا اعتراف ہے، ایسی حالت میں میرے برزخ کا آپ کے لئے میزاب رحمت بننا محض فیض ربّانی پر موقوف ہے، جس وقت فضل رحمانی آپ کے تشنہ دل کی سیرابی چاہے گا، اس وقت میرا واسطہ آپ کے لئے چشمۂ فیض ہوجائے گا۔ میں نے برسوں بزرگوں کی جوتی سیدھی کی ہے، متعدد کتابیں بھی دیکھی ہیں، مجھے یہی معلوم ہوا کہ حقیقی یا مصنوعی پیر و مرشد کچھ نہیں کرسکتا، جب قدرت کو کسی کی ہدایت منظور ہوتی ہے...... تو کسی نہ کسی صورت سے کسی کو آڑ بنا کر فیضان ہوجاتا ہے۔

آپ کا کام ہے زمین تیار کیجئے، درد اور ٹیس پیدا کیجئے، ذکر و شغل سے قلب کو گرم و نرم بنائیے، اپنے طور پر جس قدر ہو سکے تواضع و خاکساری پر عمل پیرا ہوجئے۔

ہر کجا پستی ست آپ آنجا رود   ہر کجا خشکی ست سیرابی شود

جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہیں جاتا ہے، جہاں خشکی ہوتی ہے سیرابی وہیں ہوتی ہے۔

برادر من! میں آپ کو مایوس نہیں کرتا، صحیح راہِ عمل پیش کرتا ہوں، یاس و قنوط اسلام کے خلاف ہے، اَنا عند ظن عبدی بی، خدا کے ساتھ نیک گمان رکھو، لمحہ میں وہ خاک کو اکسیر اور مس کو زر کر دیتا ہے، کفر کو توحید اور زندیق کو ولی صادق بنا سکتا ہے۔

(مکاتیب ریاضیہ: ص: ١٢٧)

ایک سالک کو مولانا تحریر فرماتے ہیں:

جب تک انسان میں ایک خاص بات نہ حاصل ہوگی، اس وقت تک حالتیں بدلتی رہیں گی، کبھی قبض، کبھی بسط، کبھی نقارۂ شادمانی ہے، کبھی ماتم کی صفیں بچھی ہیں، کبھی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی ہیں، کبھی دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔

> عزیزم! تم بہت چکر میں مبتلا ہو، تم میں جذبۂ رحمانی بھی کام کرتا ہے، اور نفس و بدن کی کثافت وظلمت بھی .... حائل ہو رہی ہے، ایسی حالت میں دیکھنا ہے کہ کس کا غلبہ ہوتا ہے، اور کشتی کس ساحل پر پہونچتی ہے۔
>
> یاد رکھو! خدائے قدوس کے یہاں عمل پسندیدہ ہے، مگر یہ ہرگز پسند نہیں کہ عامل اپنے عمل پر ذرا بھی اترائے یا اس پر اعتماد کرے۔ ے
>
> نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی (ص:۱۲۹)

قلب انسانی مظہر تجلیات: انسان کے پورے وجود میں سب سے اہم اور مرکزی حصہ قلب کا ہے، حدیث میں اسے تمام بدن کا مرکز ارشاد فرمایا گیا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ:

> ”قلب پر ہمیشہ توجہ مرکوز رکھو، دل ہی کے اندر جوالامکھی پہاڑ، گنگا جمنا کے دھارے، سورج چاند کی شعاعیں موجود ہیں، تمام ظلال وعکوس اسی دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، یہ سب معبود حقیقی کی تجلیات تہہ بر تہہ ہیں، یہ حسن قدیم کتنے پردوں میں روپوش ہونے پر بھی شمس وقمر، ارض وسما کے بھیس میں نمایاں ہے، مگر اس تماشہ کے لئے مردِ میداں چاہئے، تم آنکھ بند کرنے سے پہلے اپنے بل بوتہ، طاقت، علم، صلاح وتقویٰ سب کو رخصت کردو، پھر اس ماں کی طرح جس کا اکلوتا بیٹا مر گیا ہو، آہ وزاری، شیون وبکا کرتے ہوئے اس کی بے نشانی کا نشان لگاؤ، زندگی میں موت اور موت میں حیاتِ جاوید کا مزہ چکھو، سب ہنگاموں سے آنکھیں بند کرلو۔ (ص:۱۲۹)

طالب اور مرید کو کیسا ہونا چاھئے: کسی بزرگ سے بیعت ہو جانا یوں تو آسان ہے، مگر راہِ مولیٰ کے سچے طالب کو کن اوصاف سے متصف ہونا چاہئے؟ بعض ابتداء ہی میں کچھ پڑھ پڑھا کر، کچھ بزرگوں سے سن سنا کر مشیخت کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

’’اسی لئے میں کہتا ہوں کہ طالب بننا بھی ہرکس وناکس کا کام نہیں ہے، سلوک وکمال تو بعد کی چیزیں ہیں، سلوک کا اول قدم تو توبۂ نصوح ہے، إن الله یحب التوابین ، مرید اسے کہتے ہیں جو اپنے تمام ارادوں سے خالی ہوجائے، عبادت مولیٰ اس کا مقصد ہو، ذوق وشوق، مشاہدہ وانوار ایک چیز کی بھی خواہش اس کے قلب میں نہ ہو، افعالِ ذمیمہ وحرکاتِ قبیحہ سے یک لخت پاک ہو، میرا یہی مسلک ہے۔

گرتو نمی پسندی تغییر کن قضارا

میں نہیں سمجھتا کہ اس قدر بلند حوصلہ کس صلاحیت پر موجزن ہوتا ہے، فرضی طور پر مولویت کی چادر جو عرف نے اڑھادی ہے، وہ اگر چھننے لگے تو اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک شمہ برابر خودی وخود بینی باقی ہے، بھائی جان! براندازۂ خود بخواہ کا جملہ یاد رکھو، شب کی غفلت، دن کی فضول گوئی، ۲۴؍ گھنٹے دریائے خودی میں غسل غرقابی! ایسی حالت میں الطاف ربانی کی شکایت؟ ازسرنو اپنی حالت کا جائزہ لو، اغیار کو گوشہ ہائے دل سے نکالو، مراقبۂ احدیت کی مشاقی بکثرت کرو، اس تمام تحریر سے یہ نہ سمجھو کہ میں غصہ میں لکھ رہا ہوں ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ہر لمحہ اپنا موقع اور قدر مراتب سمجھنا چاہئے۔ (ص:۱۳۴)

درویش کے دوقدم : ایک خط میں مولانا ترک دنیا کے سلسلے میں انسان کی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’درویش کا پہلا قدم یہ ہے کہ دنیا سے نفرت ہوجائے۔ دوسرا قدم اپنے نفس وطبع کی خواہشات کو ذبح کردے، اس کے بعد ذکر ومراقبہ کا درجہ ہے، جب تک پہلے دو پر نہیں حاصل ہوتے، عالم قدس تک پرواز کرنا ناممکن محض! (ص:۱۳۸)

ھادی حقیقی اور اصلی پیر: مولانا کی نگاہ ہمیشہ مقصد اصلی پر رہتی ہے، واسطوں کا احترام وہ بہت کرتے تھے، مگر واسطہ ہی کی حد تک انھیں مقاصد کے

درجہ تک نہیں پہونچنے دیتے تھے۔ ایک مجذوب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’میاں بصر علی کو آپ سے محبت ہے، خوشی کی بات ہے، وہ پہلو میں زخم خوردہ دل رکھتا ہے، دماغ کی کمزوری اور علم کی قلت کامیاب نہیں ہونے دیتی، مگر جو اس کے عشق میں مرجائے یہاں نہیں تو وہاں ضرور کامیاب ہوگا، اس کو یاد رکھو کہ ہادیٔ حقیقی اللہ تعالیٰ ساتھ ہے، اصلی پیر رسول اکرم ﷺ ہیں جہاں میں ان دونوں کا ساتھ نہ چھوٹے، باقی ہوس۔ (ص:۱۳۹)

رسائی کا سامان: ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

’’خدا نے آپ کو نازک و رقیق قلب عطا کیا ہے، جلد سے جلد متاثر ہو جاتا ہے، اچھی بات ہے، دل کی جلوہ گاہ میں کیا کیا رُونمائیاں ہوتی ہیں، دیکھنے والے دیکھتے ہیں، اور حسرت و یاس سے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں، یہاں فراق کا نام وصل ہے، بعد کا نام قرب یا قرب کو وصال کہتے ہیں، اور وصال کو محال!

بھائی جان! قلب کے حریم میں گذر آسان ہے؟ بہت مشکل نفس کو رام کرنا ہے، حسد، بغض، عجب، کبر، شہوت، حرص، حب مال وزر، ہر آن اس کی ٹوہ لگاتے رہئے کہ کتنے دشمنوں کو مار چکے، یہ کمبخت مرنے کے بعد زندہ ہو جاتا ہے، اس کو کچل دینا خاص فضل الٰہی ہی سے ہوسکتا ہے، ایک خلق قبیح کو لیجئے اور روزانہ محاسبہ کیجئے کہ اب کس قدر مٹا اور کتنا باقی ہے، آخر شب طوفان اشک سے اس کے خس وخاشاک کو بہایئے، قلب کے انوارِ حقیقی، اس کی فنائیت پر منحصر ہیں، وساوس وخطرات کے گرد وغبار اس کے آوردہ ہیں، جب دو چار گھنٹہ تک دل حریمِ محبوب کی سیر سے نہ گھبرائے تو سمجھئے کہ رسائی کا سامان ہو رہا ہے۔ مراقبہ، ذکر، وقوف قلبی یہ اسلحے ہیں، طالب کو سربکف، کفن بردوش ہونا چاہئے، آج کل بہت سے گرگ، سگ، خوک، جو کفر حقیقی کی ...... جنید وبایزید کے لباس میں نظر آتے ہیں، ان سے بچو، کوئی نہ کچھ دے سکتا ہے نہ بتا سکتا ہے،

> میں نے تمہیں ہادیٔ حقیقی، کارساز دوعالم کے دروازہ پر کھڑا کردیا ہے، جو مانگنا ہے اس سے مانگو، مجھ کو بھی انھیں اجنبیوں میں سمجھو۔ (ص:۱۴۰)

تصوف کی روح :تصوف کے متعلق لوگوں میں بہت سی غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں، اس سلسلے میں کچھ تو معاندین ومنکرین نے غبار اڑایا ہے، اور کچھ خود اہل تصوف کی غلط اندیشیوں کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہوا ہے، کتنے لوگ ہیں جو تصوف کی اصطلاحات اور راستے کے پیچ وخم کو مقصود ومطلوب بنالیتے ہیں اور اسی میں چکراتے رہتے ہیں، حالانکہ تصوف کا مقصود کچھ اور ہی ہے، حضرت مولانا اپنے ایک مکتوب میں مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کی کسی عبارت کا مطلب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ’’طالب اپنی طلب کو خالص لوجہ اللہ رکھے، حصول مطلوب کا تخیل یا عدم حصول کا (اندیشہ) اس کے سلوک کے لئے سنگ راہ نہ ہو، اپنے آپ کو مشیت الٰہی کے سپرد کردینا اس کا فرض ہے، آئندہ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، مقام، حال، فنا، بقا، ملکہ، دوام ان میں سے کوئی مطلوب نہیں، مطلوب اصلی رضاء مولیٰ ہے اور بس! (ص:۱۴۲)

اس عبارت میں مولانا نے تصوف کا خلاصہ اور اس کی روح بیان کردی ہے، کہ اصل مقصد رضاء مولیٰ ہے، باقی سب چیزیں اسی کے حصول کے لئے مقدمات وتمہیدات ہیں، یہ مقصد نہیں حاصل ہوا، تو سب ہیچ ہے۔

قربِ الٰهی کیونکر حاصل هوتا هے؟

ایک خط میں منتشر خیالات پر تنبیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’آپ کا دماغ کبھی افکار وخیالات سے خالی نہیں رہنے پاتا، اگر تنہائی بھی نصیب ہوئی، تو باہر سے خلوت تھی اور اندر مجلس آراستہ ہے............قربِ الٰہی، جھاڑ پھونک اور تنتر منتر سے نہیں ہوتا، اس کے لئے اپنے آپ کو مٹانے کی ضرورت ہے، ؎

تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

مٹانے سے مراد یہ ہے کہ آپ اپنی قوت ادراک وشعور کو ذات احدیت کے ساتھ اس طرح وابستہ کردیجئے کہ جب آپ کو وکیل احمد پکارا جائے تو یہ نہ سمجھیں کہ وکیل احمد میرے ہی وجود کا نام ہے، سب بھول جائیں، ماسوا سے ذہول ہوجائے، اور ذکر الٰہی کا دل ودماغ پر ایسا غلبہ ہوجائے کہ ذکر، ذاکر سب خیمہ توڑ لے جائیں۔ ایک محبوب حقیقی قلبی تمثال ہو، اور سویدائے قلب کے ایک نقطۂ امکان پر مرتبۂ وجوب کا انعکاس ہو، ایک لمحہ کے لئے یہ تجلی برقی آجائے تو خرمن عقل کو جلا کر خاکستر کردے، یا کسی گوشہ میں بے چاری انانیت دم بخود ہوکر سمٹ جائے، جلوۂ ناز کے بعد پھر وظائف کی گلیوں میں سیر کرنی پڑے، تلاوت قرآن شریف پر مداومت کرو، مردمیدان کی طرح طعام وشراب، سونا آرام کرنا یکلخت کم کرو یا گم کرو، تمہیں نہ کہیں جانا ہے، نہ دوسری جگہ ڈھونڈھنا ہے، وہ آگ کا شعلہ تمہارے ہی دل کے آتش کدہ میں ملے گا، انگیٹھی سلگاؤ، ذکر خفی اثبات ونفی، ذکر اسم ذات، مراقبہ معیت پر مداومت کرو، خلق سے بقدر ضرورت ملو، گوشۂ تنہائی اختیار کرو۔

ألا یا ایها الساقی أدر کاساً وناولها
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے اُفتاد مشلها

ذکر کثیر: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ذکر کثیر کا حکم دیا ہے، اس حکم کی تعمیل کس طرح ہو، اس سلسلے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ:

’’آپ کے سوال کا تحقیقی جواب تو ائمہ فن کی کتابوں کے دیکھنے کے بعد دیا جائے گا، اپنا خیال لکھتا ہوں۔ اصل ’’ذکر کثیر‘‘ تو درحقیقت ذکر قلبی کی صورت میں ہی حاصل ہوتا ہے، جب ذکر قلبی کی نعمت حاصل ہوگئی تو ذکر کے بعد فکر ومراقبہ کے دریا میں غوطہ لگانا چاہئے، تاکہ تجلیات ومکاشفات حقائق کا دروازہ کھلے۔ (ص:۱۵۰)

نظر کی بلندی اور ثبات واستقامت:

ایک خط میں سالک کو اس طرح اصل کام پر متوجہ فرماتے ہیں، اور حوصلہ بخشتے ہیں

کہ روح وجد میں آجاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب! اصطلاحات کا جان لینا بہت آسان ہے، مشکل مرحلہ عمل وثبات واستقامت کا ہے، ہائے اللہ تعالیٰ راہِ سنت پر چلنے کی توفیق دے دیتا، اور جو جواہر ریزے حضور ﷺ نے اپنے سینۂ اطہر سے، حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے سینۂ پاک میں ڈالے تھے، اس آفتاب عالمتاب کی ایک ادنیٰ شعاع ہی جلوہ ریز ہوجاتی! کشف وکرامات میری آنکھوں میں ایک دانۂ جو کی قیمت بھی نہیں رکھتے۔

ہمہ شہر پُر زخوباں منم وخیال ماہے

ہائے یہ کمبخت کسی ادنیٰ معیار پر راضی نہیں ہوتی۔

چہ کنم کہ چشم بدبیں نہ کند بکس نگاہے

میرے عزیز! دنیا کے لعل وجواہر جو آخرت کے بازار میں ٹھیکرے اور خزف ریزے سے بھی بدتر ہیں، ان میں الجھنا مردوں کا کام نہیں، مرد مومن کی نگاہ کنگرۂ عرش تک پہونچ کر بھی اپنی محرومیت پر اشک ریز رہتی ہے۔

شب دیجور میں کوئی نیند کا متوالا ہے، کوئی متاعِ ہوس کا شکار ہے، مگر اللہ کے بندے جب کروٹ بدلتے ہیں اور جب آنکھ کھلتی ہے، صرف حسن حقیقی کی طلب میں آنکھوں سے گنگا جمنا بہاتے ہیں۔

وقوف قلبی کی مداومت مبارک، خیال میں الجھا رہے دل، اسی سراغ سے نشان کا پتہ چلتا ہے، خوب غوطہ کھاؤ، خوب ڈوبو، خوب دوڑو، پیران سلاسل کی ہمتیں تمہارے ساتھ ہیں۔ (ص:۱۵۶)

معرفت الٰہی اور قلبی ذوق وشوق: انسان نے اپنی زندگی میں اگر اللہ کی محبت ومعرفت نہ حاصل کی، تو وہ ایک بے جان زندگی اور ایک مردہ لاش ہے، اس میں اور جمادات میں کیا فرق ہے، یہ معرفت کب حاصل ہوتی ہے؟ اور قلبی ذوق وشوق

نہ ہوتو زندگی میں کیا نقص رہ جاتا ہے؟ مولانا لکھتے ہیں:

> ''برادر محترم! جب تک ماسوا کی محبت دل سے نہ نکلے، معرفت الٰہی ناممکن! عبادات صوری میں اگر قلبی ذوق وشوق کی آمیزش نہ ہو، تو وہ عبادت صرف ایک ظاہری لخلخہ ہے، اور بس! قربِ الٰہی پیدا ہونے میں شک وتردد ہے، شریعت مطہرہ کے مطابق ہر عمل ہونا چاہئے، جوسنت میں نہ ملے اس کا ترک کردینا بہ نسبت کرنے کے بہتر ہے، اتباع سنت سے غیر کی محبت دل سے نکلتی ہے، اس نسخہ کو محفوظ کرلیجئے۔ (ص: ۱۶۰)

طریقت کا راستہ :سلوک وطریقت کے سلسلے میں ستم ظریفوں نے اور استخواں فروشوں نے عجب عجب بادِ ہوائی اڑا رکھی ہے، کوئی اسے کتاب وسنت کا مخالف ٹھہراتا ہے، اور کوئی اسے شریعت سے جدا ایک مستقل اکائی قرار دیتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ طریقت کا راستہ کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے، ہوا پر اڑنا یا پانی پر چلنا کوئی کمال نہیں، یہ سب شیطانی مکر واستدراج ہے، مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسا آدمی سحر سامری اور کرشمۂ دیو میں پھنس سکتا ہے، توبہ کیجئے۔

محال است سعدیؔ کہ راہِ صفا　　تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

تصوف ایک جذبۂ بے قرار ہے :تصوف، طلب کا ایک جذبہ ہے، جو انسان کو ہمہ دم مولائے حقیقی کی یاد میں اوراس کی تلاش میں بے قرار رکھتا ہے، اور یہی بے قراری حصول مقصد کا زینہ ہے، اگر یہی نہ ہوتو انسانی زندگی ایک لاشۂ بے جان ہے، جسے آدمی اپنے کندھے پر ڈھو رہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''عمر عزیز برف کی طرح پگھلتی جارہی ہے، ہوا وہوس اور لایعنی کاموں میں پھنس کر اصلی مقصد سے ناآشنا رہنا انتہائی بدبختی ہے۔ میرے عزیز! التصوف هو الاضطراب، جس دل میں سکون وقرار آگیا وہ مہجور اور محبوب سے دور ہوگیا، طالب کو ہمیشہ طلب محبوب میں بے چین رہنا چاہئے، دنیا میں اندھا آخرت میں بھی اندھا

ہوگا۔ آفرینش انسانی سے مقصود، معرفت خالق حاصل کرنا ہے، اور معرفت ہرگز حاصل نہیں ہوتی، جب تک معروف میں فنا نہ ہو جائے، جب یہ حالت فنا حاصل ہو جائے، تو سمجھو کہ معرفت کے پھاٹک پر پہونچے، دل میں کرب و درد ہونا چاہئے، شاید کسی وقت محبوب کی معرفت کے دروازے کھلیں، دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے شرم کرنے کی چیز ہے، جو کرنا چاہئے یعنی تحصیل معرفت اللہ! وہی مفقود ہے۔ میرے عزیز! آخری جدوجہد اسی میں صرف کرو، ظاہر اعمال سے معمور ہو اور دل میں محبوب حقیقی کی تڑپ اور بے چینی ہو۔ (ص:۱۶۳)

منافع وثمرات کی کمی کی وجہ: مولانا فرماتے ہیں:

’’میرے عزیز! منافع وثمرات کی کمی دو وجہ سے ہوتی ہے، کبھی دینے والے نے نہ دیا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے سمندر ٹھاٹھ مارتا ہوا چلتا ہے، مگر شیشی میں گنجائش نہیں، یہ دریا کا قصور ہے یا ظرف کا؟ اور اگر دونوں موجود ہیں تو خطرات و وساوس کے جھونکے ہنڈیا کو سکون کے ساتھ جمنے نہیں دیں گے۔ خیر جو کچھ ہو، طالب کا وظیفہ یہ ہونا چاہئے کہ ہر روز اپنا فرض ادا کرتا جائے، حظ نفس اور شفاء نفس کا طالب نہ ہو، ہر حرکت و سکون و کیفیت و حال جو کتاب و سنت کے مطابق ہو اس پر کوشاں ہو، اس کے خلاف ہو تو لاحول پڑھے۔ (ص:۱۶۷)

تصور شیخ اور رابطہ: تصور شیخ، حضرات اصحاب تصوف کے درمیان ایک معرکہ آراء مسئلہ ہے، یہ ایک نازک چیز ہے، بعض لوگوں کے لئے بعض خاص حالات میں مشائخ نے اس کی اجازت دی ہے اور عموماً اس سے منع فرمایا ہے۔ مولانا اس کے سلسلے میں ایک فیصلہ کن بات ارشاد فرماتے ہیں:

’’آپ نے جو مسئلہ دریافت کیا ہے، وہ مسئلہ تصوف کے اندر اہم مسئلہ ہے، تصور شیخ، صورت مثالی شیخ کی آنکھوں کے سامنے لانے کو کہتے ہیں، بغرض عبادت ایسا کرنا شرعاً

> ناجائز ہے، اور بغرض اجتماع خاطر و دور کرنے خیالات فاسدہ کے جائز ہے۔ رابطہ ایک قسم کا تعلق ہے، جو شیخ و مرید کے درمیان غایت محبت کی صورت میں پیدا ہوتا ہے، اس کو اکسیر اعظم کہتے ہیں، اس میں ''خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے'' یہ مثل صادق ہے، تصور شیخ جو بلا ارادہ حاصل ہو غنیمت، اور بہت زیادہ مفید ہے۔ (ص:۱۷۴)

جو کچھ تصور میں آیا وہ خدا نہیں ہے:

راہِ مولیٰ کا سالک جب ذکر و شغل میں منہمک ہوتا ہے، تو اس کا دل و دماغ تجلیات نورانی کا مرکز بنتا چلا جاتا ہے، اس دوران مختلف صورتیں اس کے سامنے ہویدا ہوتی رہتی ہیں، بعض صورتیں دماغ کے پردے پر جم کر رہ جاتی ہیں، سالک کبھی کسی صورت کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے۔ مولانا اس غلط فہمی کو دور فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرے محترم! دماغ میں جو صورتیں آتی ہیں، وہ دماغ کی پیدا کردہ ہیں، خدا کی ذات و صفات بے چونی و بے چگونی میں اپنی جگہ پر ہے، مگر جو ہمارے دماغ و احساس نے خدا بنایا ہے، اس خدا کے ہم خالق ہیں اور وہ ہماری مخلوق! اس دلفریب پردہ کو چاک کر دینا اپنا فرض ہے، خیر وحشت و غفلت کو ترک فرما کر اسی کھوج میں نکلئے، اسماء حسنیٰ کا ہر ہر اسم، اس کی تجلیات کا ایک روشن مظاہرہ ہے، عبادات اور یادِ حق میں رہنا، یہ اصل وظیفہ ہے۔ (ص:۱۷۹)

ایک طالب کو نصیحت:

> ''محبت نامہ کاشف حالات ہوا، سوالات کا دور گزر چکا، اب ضرورت اس کی ہے کہ سب کاموں کو چھوڑ کر ایک کے ہو کر کام کیجئے، قدرت الٰہی نے جو شعلۂ محبت قلب میں ودیعت رکھا ہے، اس کو ہوا دیتے رہیں، ماسوا کے خس و خاشاک کو یادِ الٰہی کی ہی آتش خرمن سوز سے جلایا جا سکتا ہے، عذر، حیلہ، بہانہ کے دن بیت گئے، ہوا و ہوس کے برق عالم سوز نے خرمن زندگی کو خاکستر بنا کر چھوڑ دیا۔

میرے عزیز! اب لفظ و عبارت کے جامہ کو پھاڑ کر حقیقت عریاں ہونی چاہتی ہے۔ یہی وقت ہے جب دیدار الٰہی کی ساعت سعید نصیب ہوگی، قرب واختصاص اور وحدانیت الٰہی کا راز فاش ہوگا، کوہِ طور کی تجلیات باصرہ وبصیرت کو تارو ریزہ کریں گی، آپ بحمداللہ خوش نصیب ہیں کہ اوائل شعور سے دیدۂ ودل کو فرش راہ بنائے ہوئے ہیں، عمل و کردار میں توحید وسنت کا جلوہ ہونا چاہئے، ہروہ پردۂ حقیقت جو شریعت کے جام جم کے مخالف ہو، اس کو رد کردیجئے، قول وعمل وحال شریعت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہونا چاہئے۔ (ص:۱۸۵)

’’آدمی وہ ہے جس میں طلب مولیٰ کا جذبہ ہو، دنیا کے طالب تو سبھی ہیں، اس سے کسی کو چارہ بھی نہیں ہے، جائز وناجائز کا البتہ فرق ہے، طالب مولیٰ ذکروفکرالٰہی کو غذا سمجھتا ہے، اور دنیا کے مشاغل کو بمنزلہ دوا کے جانتا ہے، بیمار کو دوا کرنا ضروری ہے، مگر دوا اتنی ہی استعمال کی جائے گی، جس سے صحت حاصل ہوجائے، لہٰذا غذا جہاں تک ہضم ہو آدمی کھاتا ہے، آپ افکاروتردد سے بچنے کی انتہائی کوشش کرتے رہئے، اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ اپنے جمال جہاں آراء کو ہٹا کر مال ومتاع کی بے روح ومردۂ پُرفریب عورت کا شیدائی نہ بنائے، ایسا بہت ہوا ہے کہ امتحان عشق میں محبوب حقیقی نے مجازی حسن وجمال کی دلفریب صورت دکھا کر روح ونفس کی کشاکش کا امتحان لیا، بہت مال، زر، زمین، جاہ اور نام ونمود کے طالب نکلے، کھرے کھوٹے کا پردہ کھل گیا، متقی وصالح کے لئے دنیا ضروری ہے، مگر وہ ایک محبوب حقیقی کا کرشمہ ناز ہے، سوکھی روٹی پر گزارہ کرنا چاہئے، خلوت راز میں گریہ وزاری، آہ وبکا کے قدم سے منزل طے کرکے دامن محبوب پکڑنا چاہئے۔ (ص:۱۸۷)

عاجزی ونیستی: مولانا جو سراپا تواضع ووفا تھے، ایک مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں:

''بھائی! میں خود گم کردۂ کارواں ہوں، کسی کی جستجو میں کہاں سے کہاں نکل آیا۔ اعضاء جواب دے چکے اور دے رہے ہیں، آخری گھنٹی کا وقت آ گیا، اب تک بجز بارِ گناہ کے کچھ بھی توشۂ راہ نہیں ہے، صرف تم عزیزوں کی دعائے نیم شبی اور اکرم الاکرمین کے کرم غیر متناہی کا آسرا ہے۔ (ص:۱۸۸)

دل کا اطمینا ن اللہ کی یاد میں ھے:

''تم نے جو کچھ لکھا، حقیقت کی ترجمانی کی، دنیا کے عجائب خانہ میں، قسم قسم کے تماشے ہیں، کبھی مجلس نشاط ہے کبھی صف ماتم، کسی کو خزاں ہے، کسی کو بہار، بقاء ودوام صرف ایک ہستی کے لئے ہے، زمانہ شاہد ہے اللہ بس، باقی ہوس۔

دل کی طمانیت اللہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ وابستہ ہے، آدمی کو چاہئے کہ اسباب معاش سے فراغت کے بعد اسی دھن میں لگا رہے، چھپرہ میں شاید تمہیں فرصت نہیں ملتی کہ یکسو ہو کر لگاتار نگاہ کو ایک مرکز پر جمع کرو، تمہارے پہلو میں ایک زبردست لاہوتی کارخانہ کھلا ہوا ہے، تمام کارکن اس کے خاموشی سے کام میں لگے ہوئے ہیں، تم بھی اسی میں لگ جاؤ۔ (ص:۱۹۳)

اصل کار محبتِ الٰھی ھے: فرماتے ہیں:

''اصل کار محبت الٰہی ہے، محبت ہی سے سب پروان چڑھتے ہیں، جس نے جو کچھ پایا، اسی سے پایا، دنیا میں خوف وذخیرۂ آخرت اگر نصیب ہوجائے **فھو المراد**، محبت حقیقی ہی ان برکات کی موجد ومثمر ہے، حضرت شبلیؒ ۴۰رسال تک خوف آخرت اور ترس گور سے ڈرتے رہے، حضرت شیخ موصل اس قدر روئے کہ چہرہ کے گوشت پوست جھڑ گئے، یہی گریۂ نیم شبی اور آہ نالۂ صباحی، اللہ تعالیٰ کی نعمت بیکراں ہے، جس کو وہ عطا کرے۔

کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ چاہتا ہے میں تجھ سے سے ہوں یارب طلبگار تیرا

تعطل وبیکاری میں زندگی گذری، اب ایسا سودا کرنا چاہئے کہ سیئات مبدل بہ حسنات ہوجائیں، اس کے لئے خلوص اور صحیح توبہ وانابت کی ضرورت ہے، دنیاوی ضرورت سے فرصت پاکر **فإذا فرغت فانصب وإلیٰ ربک فارغب** پر عمل ہونا چاہئے، صحبت اغیار سم قاتل ہے، خلوت وتنہائی اصل مایۂ سعادت ہے۔ (ص:۱۹۵)

ایک طالب علم کو نصیحت: دارالعلوم دیوبند کے ایک طالب علم جو حضرت مولانا کے خاص شاگرد ہیں، اور دنیائے علم میں قاضی شریعت مولانا محمد قاسم صاحب مظفرپوری کے نام سے معروف ہیں، بہت دیندار ومتواضع اور لائق وفائق عالم ہیں، انھیں ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”علم کی وادیوں میں سیر تو ہوتی ہی ہوگی، ضرورت ہے کہ مشاعر ومدارک کے مخصوص گوشوں میں وقت کی نگاہ ڈالی جائے، علم دین کے اجزائے ثلاثہ پر ہمت مصروف ہو، بالخصوص تفسیر وحدیث کو خاص موضوع بنالیا جائے، اس کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی اپنا وظیفہ بنالو، اس کے بعد جو وقت بچے، اسے حضرت شیخ کی صحبت کیمیا اثر میں صرف کرو، انسانیت کی تکمیل انھیں اکابر کی نظروں سے ہوتی ہے۔ (ص:۲۰۱)

حضرت شیخ سے مراد، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ ہیں۔

انھیں مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کی فراغت کے موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

> ”اب غالباً تم ساقی کے میخانے سے مستانہ وار جانب وطن آنے والے ہو، خدا کرے تمہارا دامن گلہائے مراد سے بھرا ہوا آئے، عالم روحانیت کے دربار گہربار کے علوم واسرار سے تمہارا سینہ گنجینہ ہوجائے، مگر یاد رکھو، ہر کجا پستی است آب آنجا رود، تواضع کی رسی ہونی چاہئے، **رب زدنی علماً** کی رٹ ہو، عالم حقیقی تو واجب الوجود ہی ہے، مجازی انتساب کا شرف بھی اسی کو آتا ہے، جو سرحد جہل کو علم کے اطراف سے متمیز کرلے۔

خدا کرے اگر تمہیں بہار آنا پڑے تو ایک بار مجھ خزاں رسیدہ شخص پر بھی نسیم روح افزا کا گذر ہو جائے۔

؎

اے گل! بتو خرسندم تو بوئے کسے داری (ص:۲۰۴)

حضرت مولانا ریاض احمد صاحب چمپارنی علیہ الرحمہ کے مکاتیب کے چند اقتباسات اس کوتاہ قلم نے پیش کر دیئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے تمام مکاتیب از اول تا آخر انتخاب نہیں، حسن انتخاب ہیں، بڑی مشکلوں سے دل کو روک کر، قلم کو تھام کر، اتنے اقتباسات پیش کئے گئے، ورنہ جی چاہتا تھا کہ سارے ہی مکاتیب لفظ بہ لفظ نقل کر دوں۔

ان سب مکاتیب کو پڑھیئے! ایک ہی مضمون ہے جو سو رنگ سے باندھا گیا ہے، اور وہ وہی ہے، جو اللہ والوں کے دل کی لگن ہے، جس کے لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لائے۔ وہ ہے رضاء الٰہی کے لئے مرمٹنا اپنے کو فنا کر کے اس کا نام بلند کرنا، تمام خطوط کا مرکزی مضمون یہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل میں اس جذبۂ بے تاب کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں ہے، کاش یہ باتیں ہر مسلمان کے دل میں اتر جائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا سیّد شاہ محمد ہارون صاحبؒ

(خانقاہ خیرآباد، بگہا، ضلع چمپارن)

ضلع سارن (موجودہ ضلع گوپال گنج) کے نامور بزرگ اور صاحب نسبت شیخ کامل حضرت شاہ نعمت اللہ قدس سرہٗ نے بیسویں صدی کی ابتداء میں اپنے ایک مرید وخلیفہ حضرت مولانا سیّد عبداللہ صاحب (جوریوتی، ضلع بلیا، کے رہنے والے تھے) کو ضلع گورکھپور (موجودہ ضلع کشی نگر) کے ایک جنگل میں مدتوں ریاضت ومجاہدہ میں مشغول رکھا، وہ غالباً انھیں ایک کارِعظیم کے لئے تیار کررہے تھے، جب ان کے مجاہدات تمام ہوئے تو حکم دیا کہ اسی جنگل میں طرحِ اقامت ڈال دو، وطن چھڑادیا، ایک جنگل میں بسادیا، لیکن اللہ والوں کا حال تو یہ ہے کہ ؎

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی   گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست، یہیں رہ پڑے، اللہ نے زمین دے دی، مکان بن گیا، سسرال والوں نے کہا، ہماری بیٹی جنگل میں کیونکر گذر کرے گی، انھوں نے بیٹی کو روک لیا، جنگل میں اسے بسنے دینے سے انکار کردیا، اللہ نے دوسری اہلیہ عطا فرمائی، پھر پہلی اہلیہ کو بھی آنے کی اجازت مل گئی، مولانا اسی جنگل میں آباد ہوگئے، حضرت شاہ صاحب نے مولانا عبداللہ صاحب کی خدمت اور انتظام کے لئے اپنے ایک مرید کریم خاں

کوایک ریاست کی ملازمت سے چھڑا کر اسی جنگل میں بھیج دیا، تھوڑا ہی وقفہ گذرا تھا کہ یہ جنگل اللہ کے نام لینے والوں کے قدموں کی چاپ سے گونج اٹھا، ہر طرف سے دیوانوں کی آمد ہونے لگی، علماء وصلحاء کی بھی اور عوام الناس کی بھی۔

ہر کجا بوئے خدا می آید خلق بیں بے سرو پا می آید

کسی نے اس کا ترجمہ کیا ہے، ؎

چلا ہی جا رہا ہے گرتا پڑتا اس کی محفل تک
جہاں سے جس نے جس حالت میں اس دلبر کی بو پائی

اس جنگل کی قریبی آبادی کا نام ''اہرولی'' تھا، اسی مناسبت سے اس خانقاہ کو ''خانقاہ اہرولی'' کہا گیا، عوام کی زبان میں ''اہرولی کی کٹی'' مشہور ہے، بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی گذر رہی تھی کہ یہاں ایک طوفان آیا، یہ طوفان ارتداد کا تھا، اہرولی اور اس کے آس پاس ہندوؤں کی کئی ریاستیں تھیں، ان سب نے مل کر اسلام پر ہلہ بول دیا، اور مسلمانوں کی ایک جاہل برادری کو جو اس علاقے میں بکثرت آباد ہے، جبراً ہندو بنالیا، ایسا لرزہ خیز طوفان تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا چراغ بجھ جائے گا، اب وقت آیا کہ اس جنگل میں آباد کئے جانے کا مقصد پورا ہو۔ حضرت مولانا نے اپنی روحانی اور علمی و عملی طاقت سے اللہ کی مدد پا کر اس کا مقابلہ کیا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں مرتد ہونے والی قوم کو ازسرنو اسلام میں داخل کیا، اس کی تفصیل حضرت مولانا سیّد عبداللہ صاحب کے احوال کے تذکرہ میں گذر چکی ہے۔

جنگل کی اسی خانقاہ میں مولانا کی پہلی اہلیہ سے ایک بچہ وجود میں آیا، مرشد کے اشارے سے اس کا نام محمد ہارون تجویز ہوا۔ ہجری ۱۳۲۸ھ تھا، اور عیسوی ۱۹۱۰ء۔ مولانا محمد ہارون کی عمر تین ماہ کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہوگیا، حضرت شاہ صاحب نے مولانا کی خدمت کے لئے جن کریم خاں صاحب کو متعین کیا تھا، وہ لاولد تھے، انھوں نے اپنی خوش بختی اور سعادت سمجھی اور بچے کو اپنی پرورش میں لے لیا، ان کی اہلیہ بھی بسا اوقات اس کٹی میں رہتی

تھیں، انھوں نے بڑے شوق اور محبت سے بچے کو پالنا شروع کیا۔

پانچ برس کے بعد کریم خاں کے یہاں حضرت شاہ صاحب کی دعا سے بچہ پیدا ہوا، جس کا تاریخی نام حضرت مولانا عبد الغفار صاحب محدث مئو نے حضرت شاہ صاحب کے حکم سے ''محمد مختار'' تجویز کیا، ان کی ولادت ۱۳۳۳ھ میں ہوئی۔ (۱) محمد مختار ساحب ڈیڑھ سال کے ہوئے تو ان کی والدہ نے بھی سفر آخرت اختیار کرلیا، کریم خاں اب بالکل یکسو ہوکر خانقاہ میں رہ پڑے، وہ حضرت مولانا کی خدمت اور خانقاہ کے انتظام کے ساتھ ساتھ ان دونوں بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے۔

مولانا محمد ہارون صاحب ابتداء ہی سے غیر معمولی ذہین اور نہایت سلیم الطبع تھے، ان کی عمر چھ سال سے زائد تھی اور محمد مختار ڈیڑھ سال کے تھے، مختار صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''محمد ہارون صاحب کی عمر مجھ سے پانچ سال بڑی تھی، وہی مجھ کو کھلاتے تھے اور میری نگرانی کرتے تھے، کیونکہ والد صاحب لنگر خانہ میں کام کیا کرتے تھے، کھیلنا کھلانا، پیشاب پائخانہ کرانا، دھونا، سارا کام وہی انجام دیا کرتے تھے، والد صاحب کو فرصت ہوتی تو دیکھ لیا کرتے تھے۔

جن لوگوں سے آگے چل کر اللہ تعالیٰ کو کوئی کام لینا ہوتا ہے، ان کو ابتداء ہی سے ایسے مشاغل میں لگا دیا جاتا ہے جس سے ان کی تربیت ہوتی رہے، ساڑھے چھ سال کے

---

(۱) یہی مختار صاحب ہیں جنھوں نے حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے حالات ایک کاپی میں قلم بند کئے ہیں۔ یہ تحریر مجھے مولانا عبداللہ صاحب کے حفید رشید اور مولانا محمد ہارون صاحب کے فرزند گرامی حضرت مولانا محمد بشیر صاحب مدظلہٗ سے دستیاب ہوئی۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے حالات جو پہلے لکھے گئے ہیں، ان کا ماخذ یہی تحریر ہے، اور اب مولانا محمد ہارون صاحب کے متعلق جو سطریں لکھ رہا ہوں، اس کا بھی ماخذ یہی ہے، اللہ تعالیٰ محمد مختار صاحب کے درجات بلند کرے، ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے تھوڑا ہی سہی، مگر حالات کو محفوظ کردیا ہے، اور حضرت مولانا محمد بشیر صاحب مدظلہٗ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس سے استفادہ کی اجازت دی۔

بچے کے ذمہ ڈیڑھ سال کا بے ماں کا بچہ لگا دیا گیا کہ اس کی دیکھ بھال کرتے رہو، اس بیچارے کی ایسی مشغولیت ہوگئی کہ بچپن کی دھاچوکڑی اور کھیل کود کی فرصت ہی نہ رہی۔

مولانا محمد ہارون صاحب جب دس سال کے ہوئے اور محمد مختار صاحب پانچ برس کے ہوگئے تو انھیں خانقاہ کی بکریاں چرانے پر لگا دیا گیا۔ خانقاہ میں ایک مدرسہ بھی تھا، اس میں مولانا بھی پڑھتے تھے اور خالی اوقات میں بکریاں چراتے تھے، دونوں بچے اب بھی ساتھ میں رہتے تھے، حضرت مولانا نے ان دونوں بچوں کی تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ مختار صاحب لکھتے ہیں:

> ”حضرت مولانا اپنے اور بچوں کو وہی کپڑے بنواتے جو وہ لوگ پسند کرتے تھے، لیکن اس کے برعکس ہم دونوں کے لئے پسند کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی، بس خود ہی دیکھا اور لے لیا، ہم لوگ اگر ناک بھوں چڑھاتے تو مارنے کو تیار ہوجاتے، اس لئے اور لڑکے حقیر سمجھتے تھے، مارکین کا کرتہ، پاجامہ اور ٹوپی بنوایا کرتے تھے، پتہ نہیں کیا حکمت تھی۔

درحقیقت مولانا کو اندازہ تھا کہ یہ بچہ آگے چل کر کچھ ہونے والا ہے، اس لئے ان کے ساتھ معاملہ کچھ اور طریقہ سے کرتے تھے، بکریاں چرانے پر لگایا تاکہ انبیاء کی ابتدائی سنت سے طبیعت آشنا ہوجائے، اپنی مرضی پر چلنے کی انھیں اجازت نہیں دی گئی تاکہ ”فناء نفس“ کا سبق ابتداء ہی سے جاری ہوجائے، مولانا محمد ہارون صاحب کا حال شروع سے ہی کچھ اور تھا، مختار صاحب اپنی سادہ زبان میں اسی دور کا ایک قصہ سناتے ہیں، بچپن کا یہ واقعہ مستقبل کے رنگ کی جھلک دکھاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> **بچپن کا کھیل** ”جب میری عمر سات سال کی ہوچکی تھی، ایک دن بعد مغرب مسجد کے صحن میں چار لڑکے جمع ہوئے، ہم دو آدمی بکریوں کے چرانے والے اور دو آدمی بھینس چرانے والے۔ اب نام بھی سنئے! عبداللہ وعلی عباس، ایک میں

(مختار) اور چوتھے محمد ہارون صاحبزادہ حضرت مولانا (جن کو میں چچا کہتا تھا) چچا صاحب نے فرمایا کہ جس طرح ابا لوگوں کو مرید کرتے ہیں، ہم تم لوگوں کو مرید کریں گے، تیار ہو جاؤ، میں نے کہا بتاشہ بھی آ چکا ہے اور تیار بھی ہیں، چنانچہ انھوں نے مرید کرنا شروع کیا، اتفاق سے دادا (حضرت مولانا عبداللہ صاحب) کی نظر پڑ گئی، انھوں نے آہستہ سے میرے والد کو لا کر دکھایا کہ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کہہ کر لوگ ہنسنے لگے اور یہاں بیعت کا کام بھی ختم ہو چکا تھا۔

اس واقعے کے بعد حضرت مولانا نے مولانا محمد ہارون صاحب کو پیر اور محمد مختار صاحب کو مرید مان لیا، مختار صاحب لکھتے ہیں:

> ''اب تو یہ حالت ہوگئی کہ جب بھی دادا کوئی چیز تقسیم کرتے تو سب سے پہلے مجھے بلاتے اور دامن والی چیز دامن میں اور ہاتھ والی چیز ہاتھ میں دیتے اور فرماتے کہ یہ تیرے پیر کا حصہ ہے، ہمیشہ کا معمول بن گیا، اگر کبھی ان کو نہیں دیکھتے تو مجھ سے دریافت کرتے کہ تیرا پیر کہاں ہے، یہ خبر حضرت میاں (شاہ نعمت اللہ صاحب) کو بھی پہونچی۔

تعلیم: مولانا محمد ہارون صاحب خانقاہ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے، بلا کے ذہین اور طباع تھے، طبیعت بھی موزوں پائی تھی، کبھی کبھی اشعار بھی کہہ لیتے تھے، کمسنی ہی کے زمانے میں ایک روز یکا یک غائب ہوگئے، مختار صاحب خبر دیتے ہیں کہ:

> ''کچھ دنوں کے بعد یکا یک غائب ہوگئے، اور کسی نے تلاش بھی نہیں کیا، حضرت مولانا بھی پتہ نہیں کیوں خاموش رہے، جلد ہی معلوم ہوا کہ سلیم پور میں رہتے ہیں، والد صاحب مجھ کو لے کر سلیم پور انھیں لینے آئے، وہ وہیں موجود تھے، محلے والے سب جانتے ہی تھے کہ مولانا صاحب کے لڑکے ہیں، اس لئے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے پائی، جب تک ہم لوگ تھے والد صاحب اپنے ساتھ کھلاتے پلاتے رہے، میرا گھر تو

ہمیشہ بند ہی رہتا تھا اسی مکان کے باہری سائبان میں رہا کرتے تھے، اور صبح کو مولانا عبدالصمد صاحب سے فارسی وغیرہ پڑھنے جایا کرتے تھے، مولانا عبدالصمد صاحب کوٹی پر رہ چکے تھے، خوب اچھی طرح جانتے تھے، اس لئے بڑے شوق سے پڑھایا کرتے تھے، اور شام کو میرے ہی گھر پر رہا کرتے تھے، جب ہم لوگ واپس آنے لگے تو والدصاحب نے انھیں گھر کی کنجی دیدی، اور لوگوں سے تاکید بھی کردی، راتوں میں محلّہ کے لڑکوں کو بلا کر پڑھایا کرتے اور رہا کرتے۔

دھلی : مختار صاحب آگے کی داستان سناتے ہیں، انھیں کے لفظوں میں سنئے، فرماتے ہیں:

> ایک بار میرے چچازاد بھائی وغیرہ جو گورکھپور ریلوے کارخانہ میں ملازمت کرتے تھے، کسی چھٹی میں دہلی کا پاس لے کر گھومنے کی غرض سے جارہے تھے، ان کو بھی ساتھ لے گئے، واپسی میں کہیں جوتا غائب ہوگیا، ایک ریٹائرڈ داروغہ صاحب نے جو حضرت کے معتقد تھے، ایک جوڑا نیا جوتا فیتہ والا پیش کیا، ان کے پاؤں میں ٹھیک آگیا، اس کو پہنا کرتے تھے، کچھ دنوں کے بعد والدصاحب نے شاید مولانا کے حکم سے بلوالیا، مولانا کی نظر جوتے پر پڑگئی، کہنے لگے ارے تو انگریزی جوتا پہننے لگا ہے، خبردار!

کچھ دنوں خانقاہ میں رہ کر پھر دہلی چلے گئے اور کسی مدرسہ میں داخلہ لے کر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے لگے، خطوط آتے رہتے تھے، کچھ عرصہ کے بعد مولانا نے بلوالیا اور پھر یہیں تعلیم مکمل کی۔

مولانا محمدھارون صاحب کی شاعری :

ہمارے سامنے مولانا کی شاعری کے زیادہ نمونے نہیں ہیں، لیکن جو کچھ ہے اس سے ان کی طبیعت کے رُخ اور ذہانت کا پتہ چلتا ہے، جبکہ وہ بالکل نوعمری کا کلام ہے۔

محمد مختار صاحب لکھتے ہیں:

’’ایک بار ہم دونوں آدمی (حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کی خدمت میں) گئے ، مولانا ریاض احمد صاحب بھی موجود تھے ، دوپہر کے وقت جبکہ دادا (حضرت شاہ صاحب) اندر کمرے میں آرام فرمارہے تھے، مولانا نے فرمایا: ہارون کچھ سناؤ، اس وقت ہم سائبان میں بیٹھے ہوئے تھے ، میرے حضرت مرشد نے ایک غزل پڑھنی شروع کی، میرے مرشد خوش گلو بھی تھے۔

ذات لاپرواہ مولا، تجھ کو پروا ہی نہیں   مرنے والا مرگیا اور تونے پوچھا ہی نہیں
حضرت ایوب کا جسم کیڑوں نے چھلنی کردیا   لوگ کہتے تھے تماشا یہ تماشا ہی نہیں
چاہ میں یوسف گرے کہلائے لوگوں کے غلام   بک گئے بازار میں تونے خریدا ہی نہیں
طشت میں رکھا گیا جب کاٹ کر یحییٰ کا سر   کیسی آنکھیں پھیرلیں گویا کہ دیکھا ہی نہیں
واہ وا ہاروںؔ تونے خوب لکھی ہے غزل   شاعروں میں ہے ابھی نام تیرا ہی نہیں

ان کی آواز دادا کے کان تک پہونچ گئی، اخیر میں دادا نے کہا ارے یہ شاعری بھی کرتا ہے، غزل بھی لاجواب تھی اور معرفت کی چیز تھی، مولانا خوب مسکرائے اور خوش ہوئے ، یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہاں سنایا تھا۔

حضرت شاہ صاحب کا مرثیہ: ۱۱/ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) حضرت شاہ صاحب کا انتقال ہوا، ۲۷/ رجب کو حضرت شاہ صاحب کے متوسلین جمع ہوئے ، حضرت مولانا سیّد عبداللہ صاحب ، حضرت مولانا ریاض احمد صاحب ، حضرت مولانا محمد جمیل صاحب اور ایک عظیم مجمع اکٹھا تھا، ابتداءً علماء کرام کی تقریریں ہوئیں، جو لوگ تاریخ وفات لکھ کرلائے تھے، انھوں نے اپنے اپنے اشعار اور تاریخیں سنائیں، اس کے بعد حضرت مولانا سیّد عبداللہ صاحب نے حکم دیا کہ ہارون کو بلاؤ، وہ آئے ، فرمایا: تم نے جو مرثیہ لکھا ہے اسے سناؤ، انھوں نے مرثیہ سنانا شروع کیا، جو جہاں تھا وہیں سکتے میں آگیا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، حضرت مولانا کا پورا جسم ہل رہا تھا، ایک کہرام مچا ہوا

تھا۔ وہ مرثیہ حضرت مولانا محمد جمیل صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ”تاریخ ولی کامل“ میں نقل کیا ہے، مرثیہ کا عنوان مولانا نے اس طرح لکھا ہے۔

”مرثیہ از صاحبزادۂ والا قدر مولوی محمد ہارون شاہ سلّمہٗ خلف حضرت مولانا حاجی شاہ محمد عبداللہ صاحب خلیفۂ اعظم مرشد برحق رضی اللہ القوی عنہٗ“ مرثیہ ہے:

الٰہی ! ابر غم کیوں چھا گیا ہے آج دنیا پر
برستی ہے در و دیوار پر کیوں یاس و حیرانی
نہ دل کو جان کی پروانہ جاں کو کچھ خبر دل کی
یہ کیسی بے قراری ہے یہ کیسی ہے پریشانی
وہ طوفاں خیز محرومی و دریا چشم گریاں کا
تمنائیں جو دل میں تھیں سبھی پر پھر گیا پانی
سناؤں داستان درد دل اے ہم نفس کس کو
نظر آتا نہیں کوئی اپنا مونس جانی
جو تھا مہماں نوازِ رہروانِ دشت حق جوئی
ہوئی ہے جنت الفردوس میں اب اسکی مہمانی
چراغ معرفت گل ہوگیا بادِ حوادث سے
الٰہی کون بتلائے گا ہم کو راہِ یزدانی
زمیں پر بزم ماتم ہے، فلک پر بزمِ شادی ہے
فلک پر مرحبا گوئی زمیں پر مرثیہ خوانی
کبھی یہ جی سے جاسکتا نہیں ہے نقش عالم میں
بسی ہے دیدۂ تر میں مرے وہ شکل نورانی
شب غم کی درازی کم نہیں روزِ قیامت سے
غم واندوہ وفریاد وفغاں ہیں مونس جانی
تڑپتا ہے دلِ ہاروںؔ، ترستی ہیں مری آنکھیں
دکھا دیجے خدارا خواب ہی میں شکل نورانی

☆☆☆☆☆☆

جب نہاں زیر زمیں روئے درخشاں ہوگیا
دن ہمارا بدتر از شامِ غریباں ہوگیا
عندلیب خوش نوا نے نغمہ سنجی چھوڑ دی
ہُو کا عالم آج صحن گلستاں ہوگیا
جب گئی جنت میں روح پاک حضرت شاہ کی
ہر طرف ازدحام حور وغلماں ہوگیا
یہ وہ صدمہ ہے کہ جو دل سے نکل سکتا نہیں
یہ وہ غم ہے جو دل بے تاب کی جاں ہوگیا
غم غلط ہوجائیگا کٹ جائیں گے فرقت کے دن
صدمۂ ہجر آپ کا سینہ میں مہماں ہوگیا
بس گئی اجڑی ہوئی بستی خدا کا شکر ہے
عکس روئے دل پر ضیاء دل میں درخشاں ہوگیا

اس غم جانکاہ سے تاب شکیبائی نہیں
دل پریشاں چشم گریاں سینہ بریاں ہوگیا
فرقت قطب زماں سے کیسی وحشت بڑھ گئی
یہ تفرج گاہ عالم مجھ کو زنداں ہوگیا
چھا گیا اطرافِ عالم میں اندھیرا ہائے ہائے
گل چراغ علم وفضل وزہد وعرفاں ہوگیا
مسند ارشاد وتلقیں سے اٹھا اک شیخ وقت
صحن عالم میں بپا ایک محشر ستاں ہوگیا
رنج فرقت سے فضائے دل ہے دشت کربلا
قتل عامِ حسرت وامیدوارماں ہوگیا
ایک ہاروںؔ میں نہیں بے قرار درد ہجر
ایک عالم ہے جو اس غم سے پریشاں ہوگیا

☆☆☆☆☆☆

یہ کلام ۱۹/۲۰/ برس کے ایسے نوجوان کا ہے جس کی ساری عمر خانقاہ میں، ایک پیر خدامست کی خدمت میں گذری ہے، اس سے مولانا کی ذکاوت وذہانت کا اندازہ کیجئے۔

والد گرامی کی وفات: (۱۹۳۵ء)

حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب نے اپنی اولاد میں مولانا محمد ہارون صاحب کو منتخب کرلیا تھا، انھیں عوام کی نظروں میں حقیر بنا رکھا تھا، ہر طرح کی خدمت لے کر انھیں مشقتوں کا عادی بناتے تھے، معمولی کھانا، معمولی کپڑا دیتے، مجال نہیں تھی کہ وہ کسی چیز کی فرمائش کریں، اگر کبھی کسی چیز کی خواہش کی تو ڈانٹ پڑجاتی، بعض اوقات حکم ہوتا کہ پاخانہ صاف کرو، اور یہ تعمیل حکم کرتے، اخیر عمر میں بیمار ہوئے تو اپنی خدمت کا سارا کام انھیں کے سپرد کیا، جب بلاتے انھیں کو بلاتے، اخیر وقت میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ غذا مطلقاً بند ہوگئی تھی، دوا بھی نہیں استعمال کرتے تھے، دوا آتی تو مولانا محمد ہارون صاحب کو حکم ہوتا کہ پی لو، وہ پی لیتے، کھانا لاتے تو فرماتے کہ تم کھالو، وہ کھاتے، چند لقموں کے بعد فرماتے اچھا اب بس کرو۔ حضرت مولانا حقہ بھی پیتے تھے، حقہ بھر کر لاتے، تو حکم ہوتا کہ تم ہی پی لو، یہ چند کش لگاتے اور حکم پاکر ہٹتے، اس سے مولانا کو تشفی ہوجاتی۔ مولانا والد گرامی کا ہر اشارہ سمجھتے تھے اور بجالاتے تھے، وفات کے روز اپنے سب صاحبزادوں کو بلایا، ہر ایک سے کہا کہ کچھ سناؤ،

سب نے سنایا، سب کو رخصت کر دیا، مولانا محمد ہارون صاحب سے کہا کہ تم سناؤ، انھوں نے آیت کریمہ: قُلْ إِنَّ صَلٰوَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ، سنائی، فرمایا الحمد للہ تشفی ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے مقام قلب پر انگلی رکھی، اور جو کچھ تصرف کرنا کیا، اس کے کچھ دیر بعد انتقال فرمایا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

ترک وطن: حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب نے نوجوانی ہی میں اپنے مرشد کے حکم سے اپنے وطن سے دور اہرولی کے جنگل میں بستی بسائی تھی، اخیر عمر میں اپنے فرزند گرامی کو حکم دیا کہ فلاں فلاں جگہیں دیکھ لو، جو پسند آئے آکر بتاؤ۔ ایک دن فرمایا کہ بگہا چلے جاؤ، کوئی اسی طرح کا جنگل مل جائے، تو دیکھ لو۔ مغربی چمپارن میں بگہا ایک قصبہ ہے، وہاں گئے، بوڑھی گنڈک کی ایک شاخ کے کنارے خَیرُ ا کا ایک جنگل پھیلا ہوا تھا، وہ سنسان جگہ دل کو بھا گئی، والد کو آکر خبر دی، انھوں نے فرمایا ٹھیک ہے، میرے مرنے کے بعد تم وہیں چلے جانا، اور وہاں اسی طرح (یہ اشارہ اپنی جگہ کی جانب تھا) کی جگہ پسند کر کے بیٹھ جانا اور کوئی فکر نہ کرنا۔۔

چنانچہ والد کے وصال کے بعد وہ اسی جگہ چلے گئے، قریبی آبادی رتن مالا کے لوگوں نے عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، رتن مالا سے پورب جانب ایک بڑا چٹیل میدان اور چھوٹا سا جنگل قدرے اونچائی پر موجود تھا، چاروں طرف اس کے نارائنی دریا (بوڑھی گنڈک) کی شاخ اس کے اردگرد چکر دے کر مل گئی ہے، بہت وحشتناک جگہ، بنجر زمین خار مغیلاں سے بھری ہوئی، یہی ان کی منزل بنی، عقیدت مندوں نے اور والد بزرگوار کے مریدوں نے اپنے پیرزادے کے لئے جانی و مالی مدد دے کر چند عدد پھوس کے مکان جلد ہی بنوا دئے، اور خود بھی صبح و شام حاضری دینے لگے، اور مولانا ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت میں اس سنسان جگہ میں مصروف ہوگئے، کچھ دنوں کے بعد اہرولی جا کر اپنے

گھر والوں کو لے آئے۔

چند ہی برسوں میں یہ ویرانہ آباد ہو گیا، خیرا کا جنگل یادِ الٰہی کی حرارت سے گرم ہو گیا ،خوشبو پھیلنے لگی، اللہ کے نام کے متوالے آنے لگے، تین چار سال کے عرصے میں کنواں بن گیا، مسجد بن گئی، ۱۹۳۵ء میں والد کے انتقال کے بعد آئے تھے، ۱۹۳۹ء میں غالباً مسجد بن گئی۔ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کے خلیفہ دوم حضرت مولانا ریاض احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے، انھوں نے خیرا کی مناسبت سے اس جگہ اور خانقاہ کا نام خیر آباد رکھا، چنانچہ اب تک یہی نام زبان زد ہے، اولادیں ہوئیں تو اور مکانات بنتے چلے گئے۔ خانقاہ اہرولی کا نقشہ خیر آباد میں جما، اللہ تعالیٰ نے خوب برکت دی، اطراف واکناف میں ہدایت کا نور پھیلنے لگا۔

مولانا نے جس وقت خیر آباد کی سکونت اختیار کی تھی، بالکل نوجوان تھے، مگر حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب علیہما الرحمہ کی توجہات اور دعاؤں نے صبر واستقامت کی تمام منزلیں طے کرادی تھیں، اور وہ ہمت وحوصلہ پیدا کر دیا تھا، کہ راہ کی تمام دشواریاں ان کے سامنے ہیچ ہوگئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے رہبری فرمائی۔ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب سلسلہ کے تیسرے بزرگ قریب موجود تھے، انھوں نے اس عالی ہمت جوان کی حوصلہ افزائی فرمائی، بار بار وہاں تشریف لائے، اس قدر انھیں اس خانقاہ کا اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے حج میں جانے کا عزم مصمم کرلیا تھا، ملنے کے لئے تشریف لائے، لیکن اللہ جانے کیا باتیں ہوئیں، کیا مصلحت سامنے آئی کہ انھوں نے اپنا ارادہ اس سال منسوخ کر دیا۔

مولانا محمد ہارون صاحب علیہ الرحمہ ٹھیک ٹھیک اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر تھے، ایک عرصہ تک حق وہدایت اور سلوک وطریقت کا نور پھیلا کر یہ آفتاب ۱۹۸۲ء میں غروب ہو گیا، مسجد کے پاس قبر شریف ہے، کہ نماز کے لئے آتے جاتے مصلی دعا وایصال ثواب کا

تحفہ پیش کرتے آئیں اور جائیں۔

تین چار سال قبل اس خاکسار کی بھی حاضری خانقاہ خیرآباد میں ہوئی تھی، مولانا کے خلف الصدق حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مدظلہٗ اپنے آباءِ کرام کے طریقے پر گوشہ نشین ہیں، نہایت بزرگ خاشع وخاضع، متواضع مہمان نواز، ان سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ چاندشاہی نسبت کی خوشبو محسوس ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ

(امیر شریعت خامس، بہار و اُڑیسہ)

غالباً ۱۹۸۶ء کی بات ہے، میرے طالب علمی کے زمانہ کے دوست جو میرے ہم درس تو نہ تھے، لیکن بہت محبت رکھتے تھے، فراغت کے بعد عرصہ تک جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور...... جہاں ہم لوگوں کی تعلیمی وتربیتی نشو ونما ہوئی ہے...... کے سفیر رہے، نہایت فعال، مخلص اور جاں نثار! صوفی ظہیر الدین صاحب! اللہ انھیں اچھا رکھے، بہت دنوں سے لاپتہ تھے، میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی، جون پور میں مدرس تھا، ایک دن اچانک آدھمکے، اور نادر شاہی حکم صادر کیا کہ ضلع سیوان کے ایک گاؤں ’’جمال احاطہ‘‘ چلنا ہے، وہاں ایک مدرسہ کے سنگ بنیاد کا جلسہ ہے، اس میں تم کو شرکت کرنی ہے، میں نے عرض کیا اس کے لئے اس قدر تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی، ۱۵/ پیسے کا کارڈ لکھ دیتے، کہنے لگے جی ہاں! میں ۱۵/ پیسے کا کارڈ لکھ دیتا، اور جواب میں تم بھی ۱۵/ پیسے کا کارڈ لکھ دیتے کہ ’’معذرت ہے‘‘ قصہ ختم ہو جاتا، تو مجھے معذرت نہیں سننی ہے، تمھیں چلنا ہی ہوگا، مدرسہ جس کی بنیاد رکھنی تھی، اس کا نام انھوں نے ’’نعمت العلوم‘‘ بتایا، اور وضاحت کی کہ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب قدس سرہٗ کے نام پر یہ نام رکھا گیا ہے، میں نے یہ نام سن رکھا تھا، مگر حالات سے واقف نہ تھا، پوچھا کہ ان کے سلسلے کے کوئی بزرگ موجود ہیں، بتایا کہ حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب نائب امیر شریعت، ان کے سلسلے کے بزرگ ہیں، وہ جلسے میں شرکت

فرمائیں گے، اس نام کی کشش ایسی ہوئی کہ میں وہاں حاضر ہونے کیلئے آمادہ ہوگیا۔

میری حاضری ہوئی، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، بہت ضعیف ہوچکے تھے، اونچا سنتے تھے، سانولا رنگ، مگر چہرہ نورِ باطن سے دمک رہا تھا، سادہ مزاج، سادہ لباس، کمر خمیدہ، پیشانی چوڑی، نگاہیں جھکی ہوئی، مراقبہ کی حالت، سر پر رومال، خاموش طبع، میں خدمت میں حاضر ہوا، بارہا جی چاہا کہ کچھ پوچھوں، مگر ہمت ساتھ نہ دیتی تھی، دیر کے بعد ہمت کرکے پوچھ ہی لیا کہ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کون تھے؟ فرمایا کہ حضرت چاندشاہ صاحب علیہ الرحمہ کے خلیفہ تھے، بہت بزرگ تھے، میں انھیں سے بیعت ہوا تھا، بس خاموش ہوگئے، شاید اس وقت کچھ اور بھی پوچھا تھا، اب یاد نہیں رہا، ہاں یہ خوب یاد ہے کہ ہر جواب مختصر تھا، دعا کی درخواست کی تو بڑی بشاشت سے دعائیں دیں۔ یہ پہلی ملاقات تھی، جس کا بہت خوشگوار اثر دل نے قبول کیا۔ دوسری ملاقات پھلواری شریف میں دفتر امارت شرعیہ میں ہوئی۔

اس طویل جملہ معترضہ کے بعد حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا ذکرِ جمیل پیش کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں تمام تر معلومات جو اس خاکسار کو حاصل ہوئی ہیں، وہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہٗ اور مولانا وصی احمد صاحب شمسی کی عنایتوں کا ثمرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں حضرات کو بہترین جزاء عطا فرمائیں۔

ولادت اور تعلیم : بہار کا مشہور مردم خیز ضلع دربھنگہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا وطن تھا، شہر دربھنگہ سے چھ سات کلومیٹر مشرق میں غوثا گھاٹ کے قریب ایک گاؤں ''پورا نوڈیہہ'' ہے، عرف میں اسے محض ''پورا'' کہا جاتا ہے۔ وہیں مولانا ۷/ اپریل ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے، مولانا کے والد محترم منشی بشارت علی صاحب طبیب تھے، مولانا بچپن سے نہایت ذہین وفطین تھے، ذہانت وذکاوت کے آثار دیکھ کر والد صاحب کو خیال ہوا کہ انھیں انگریزی تعلیم حاصل کرائیں، تاکہ آگے چل کر کوئی اچھی سرکاری ملازمت پر فائز

ہوں، اس کے لئے انھوں نے دربھنگہ شہر کے مڈل اسکول میں داخلہ کرایا، مگر اللہ جانے بعد میں کیا ہوا کہ ارادہ بدل گیا، اور انھیں وہاں سے نکال کر قلعہ گھاٹ دربھنگہ کے مشہور مدرسہ حمیدیہ میں داخل کرادیا، آپ نے عربی تعلیم مختلف مدرسوں میں حاصل کی، دربھنگہ، بتیا (چمپارن) گودنا، کانپور، رام پور اور پٹنہ میں زیر تعلیم رہے۔

فضیلت کی سند مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے حاصل کی، امتحان میں آپ پورے صوبہ میں اول آئے، انعام میں سونے کا تمغہ ملا، اخبارات نے آپ کے اس اختصاص کا اعلان کیا، ایک دھوم مچ گئی۔

مولانا نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ہے، ان میں خصوصی بزرگ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب چمپارنی قدس سرہٗ تھے۔ ان سے مولانا نے بہت فیض پایا، اس کا تذکرہ خود مولانا نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، جو ''مکاتیب ریاضیہ'' کے آغاز میں شائع ہوا ہے، اس میں مولانا لکھتے ہیں کہ:

> ''حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے طلبہ پر بڑی شفقت رہا کرتی تھی، اور سعی فرماتے تھے کہ ان کی استعداد مضبوط سے مضبوط تر ہوجائے، امتحان کے موقع پر مجھ سے اور میرے رفیق ہم نوالہ وہم پیالہ مولانا ابوالہاشم سیّد محمد شافق برنوی ثم چمپارنی سے حمد اللہ جیسی کتاب کی پوری تقریر من اولہٖ إلیٰ آخرہٖ زبانی سنا کرتے تھے، حضرت کی محنت کا اثر یہ تھا کہ ہم لوگ پوری حمد اللہ کے مضامین کھڑے ہوکر زبانی بیان کرسکتے تھے۔ (مکاتیب ریاضیہ، ص:۱۶)

تدریس: ۱۹۳۰ء میں مولانا نے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل کا امتحان پہلی پوزیشن سے پاس کیا، یہ خبر جب اخبارات میں شائع ہوئی تو فوراً ہی انھیں مدرسہ محمودیہ راجپور (نیپال کی ترائی) میں صدر مدرسی کی جگہ مل گئی، اس سلسلے میں مولانا وصی احمد صاحب شمسی نے محترم عطاء اللہ پالوی صاحب کی تالیف ''تاریخ نیک فال'' سے مولانا کی ابتدائی تدریس

کے متعلق اقتباس نقل کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

”گودنا کے مدرسہ حمیدیہ کے صدر مدرس ایک نہایت ہی مشہور و معروف و پرہیزگار بزرگ علامہ ریاض احمد صاحب تھے، موصوف کے ایک چہیتے شاگرد مولوی عبد الرحمٰن صاحب تھے، جو ضلع دربھنگہ کے پورہ نوڈیہہ کے رہنے والے تھے، محترم مولوی عبد الرحمٰن صاحب تہذیب وشائستگی کے نمونہ، رواداری و بے تعصبی کے مجسمہ، شرافت ومتانت کے پیکر اور اخلاص واخلاق کے مرقع تھے، کسر نفسی ان کی فطرت میں رچی بسی تھی، آپ کے حافظہ وذہانت کا یہ عالم تھا کہ جس درجے میں ہوتے تھے، اس کی درجہ کی بالعموم تمام کتابیں حفظ کر لیتے تھے ۱۹۳۰ء میں موصوف نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل کا امتحان اس شان سے پاس کیا تھا کہ پوری یونیورسٹی میں فرسٹ آئے تھے، اور انہیں انعام میں سونے کا تمغہ دیا جانا طے ہوا تھا، اچھے اور قابل آدمی کو ہر جگہ پسند کیا جاتا ہے، اخبار میں اس خبر کے چھپتے ہی مولوی عبد الرحمٰن صاحب کو ترائی نیپال کے مدرسہ محمودیہ راجپور میں صدر مدرسی کی جگہ مل گئی، اور وہ نیپال چلے گئے، مئی ۱۹۳۲ء میں وہ تمغہ لینے کے لئے پٹنہ تشریف لے گئے۔ مولوی مبارک کریم صاحب سپرنٹنڈنٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ بہار واڑیسہ، نہ جانے کیوں ذاتی طور پر مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں دلچسپی لیتے تھے، ان کو وہاں کے اسٹاف کی طرف سے اطمینان نہ تھا، انھوں نے مولوی عبد الرحمٰن صاحب کو تاکیدی ہدایت کی کہ وہ نیپال نہ جائیں بلکہ چھپرہ جا کر وارث العلوم میں صدر مدرس کا عہدہ سنبھالیں، مولوی عبد الرحمٰن صاحب نے پٹنہ آ کر یہ ضروری سمجھا کہ اپنے شفیق استاذ ومرشد علامہ ریاض احمد صاحب جو مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں صدر مدرسی کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے مشورہ کریں، انھوں نے مبارک کریم صاحب کی رائے سے اتفاق کیا، چنانچہ مولوی عبد الرحمٰن صاحب ۱۴/ جون ۱۹۳۲ء کو مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں وارد ہوئے۔

> مولوی عبدالرحمٰن صاحب جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، طبعًا انسانی پیکر میں ایک فرشتہ تھے، وہ مدرسہ میں پُرسکون فضا کے خواہاں تھے، مگر اس وقت مدرسہ وارث العلوم کا ماحول ان کی افتادِ طبیعت کے خلاف محسوس ہوا۔‘‘

لیکن استاذ گرامی کی ہدایت اور احباب کے پُرزور مشوروں کی وجہ سے مولانا نے اسی مدرسہ میں قیام منظور فرما لیا، چنانچہ ۱۵؍جون ۱۹۳۲ء سے بحیثیت صدر مدرس آپ نے مدرسہ وارث العلوم میں کام شروع کر دیا۔

مدرسہ حمیدیہ گودنا میں: حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں تقریباً دس سال صدر مدرس رہے، مولانا کی وجہ سے اس مدرسہ میں تعلیمی رونق خوب رہی، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جو مولانا کے برادر نسبتی ہیں، انھوں نے ابتدائی تعلیم حضرت مولانا سے اسی مدرسہ میں حاصل کی، پھر وہ مئو مدرسہ مفتاح العلوم میں داخل ہوئے اور وہاں سے فراغت حاصل کی۔

دس سال کے بعد بقول صاحب ’’تاریخ نیک فال‘‘ مولانا ۲۹؍جون ۱۹۴۲ء میں گودنا کے مدرسہ حمیدیہ میں اپنے استاذ و مرشد حضرت مولانا ریاض احمد صاحب علیہ الرحمہ کے حکم سے تشریف لائے، پھر تازندگی یہیں رہے، اور یہیں آپ کا مدفن بنا۔

چھپرہ شہر سے ۶؍۷؍کلومیٹر پچھّم مانجھی کے علاقہ میں ایک قصبہ ریول گنج ہے، قدیم نام اس کا شمس الدین پور ہے، وہاں لب دریا ’’گوتم استھان‘‘ نام کا ایک بڑا مندر ہے، اسی کی مناسبت سے ریول گنج اسٹیشن کا نام ’’گوتم استھان‘‘ رکھ دیا گیا ہے، یہ اسٹیشن مظفر پور سے بنارس والی لائن پر چھپرہ جنکشن کے بعد پہلا اسٹیشن ہے، ریول گنج سے متصل شمال مشرق میں ایک گاؤں گودنا ہے، وہاں ایک دیندار اور بڑے مخیّر رئیس شیخ منشی عبدالحمید صاحب تھے، انھوں نے جنوری ۱۹۱۱ء (۱۳۲۹ھ) میں ایک دینی درسگاہ مدرسہ حمیدیہ کے نام سے قائم کی، اور اس کے لئے ریلوے لائن کے شمال میں اپنا ایک بڑا عمدہ باغ وقف کر دیا، یہ مدرسہ اسی

باغ میں جاری ہوا، نہایت خوشنما اور پُر بہار جگہ ہے۔

۱۹۱۳ء میں حضرت مولانا ریاض احمد صاحب چمپارنی اس مدرسہ میں بحیثیت صدر مدرس تشریف لائے، ان آنے سے مدرسہ میں علم وتعلیم کی بہار آ گئی، علم دین کے جویا دور دور سے آنے لگے، مولانا کی تعلیمی لگن، ان کی بزرگی اور تقویٰ وطہارت کا اثر یہ ہوا کہ دو ہی سال میں مدرسہ خوب ترقی کر گیا، منشی عبدالحمید صاحب نے مدرسہ کا یہ عروج دیکھا تو اس کے لئے شاندار پختہ عمارت بنوادی، ایک خوبصورت مسجد پہلے ہی بنوا چکے تھے۔

حضرت امیر شریعت نے حضرت مولانا ریاض احمد صاحب سے اسی مدرسہ میں عرصہ تک تعلیم حاصل کی تھی، ۱۹۲۴ء میں حضرت مولانا ریاض احمد صاحب علیہ الرحمہ، مدرسہ حمیدیہ کی ملازمت ترک کر کے اپنے شیخ ومرشد حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوگئے، پھر دوبارہ ان سے ۱۹۲۶ء میں مدرسہ میں تشریف لانے کی درخواست کی گئی، حضرت امیر شریعت اس وقت رام پور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، مولانا نے انھیں رام پور سے بلوالیا۔

۱۹۳۰ء میں غالباً حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کے تشریف لے جانے کی وجہ سے مدرسہ حمیدیہ تقریباً بند سا ہوگیا، ۱۹۴۲ء میں اس کی نشأۃ ثانیہ کا پروگرام بنا، تو حضرت امیر شریعت کو مدرسہ کی ذمہ داری سونپی گئی، وہ اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کے حکم سے گودنا میں آ گئے۔

انداز تدریس: استاذ کا کمال یہ ہے کہ وہ طالب علم کو علم کا خوگر بنادے، اس کی استعداد کو ابھار دے، اور علم سے ایسی مناسبت پیدا کردے کہ وہ اس کی روح کی غذا اور دل کی دوا بن جائے۔ مولانا پڑھانے میں طلبہ پر بہت محنت کرتے تھے، اور ان سے بہت محنت لیتے تھے، طلبہ سے تعلیم میں محنت لینا بڑا صبر آزما کام ہے۔ مولانا کے درس میں طلبہ کو مطالعہ کرنا لازم ہوتا تھا، اس سلسلے میں طلبہ کی نگرانی فرماتے، بہت تاکید کے ساتھ مطالعہ کی

ترغیب دیتے۔

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''جب ہم نے ابتدائی عربی شروع کی تو ہر جمعرات کو مولانا قرآن کریم لے کر بیٹھ جاتے، اور جو صیغے آتے ان کی تعلیل وتصریف کا سوال کرتے، اور ہم لوگ جواب دیتے، جمعرات کا یہ سلسلہ دو گھنٹہ جاری رہتا، اس سے ہم لوگوں کو بڑا علمی فائدہ ہوا، ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ شرح مأۃ عامل کے بعد عربی عبارت صحیح پڑھنے پر قابو پالیا تھا، نورالایضاح، قدوری، مرقاۃ کی عبارت پڑھنے میں عموماً کبھی اعراب کی غلطی نہیں ہوتی تھی۔ عبارت صحیح پڑھنے پر میں قادر ہوگیا تھا، مولانا زیر زبر کی ایک غلطی بھی معاف نہیں کرتے تھے، جن طلبہ نے مولانا سے ابتدائی عربی پڑھی، ان سے عبارت میں غلطی نہیں ہوتی تھی۔''

بیعت وسلوک : حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب ابتداء ہی سے نہایت صالح، خاموش اور عبادت کے خوگر تھے، وہ بچپن ہی سے فرشتہ صفت انسان تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ طالب علمی کے زمانے میں وقت کے بڑے صاحب نسبت بزرگ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے بیعت ہوگئے، اس بیعت کا تذکرہ حضرت مولانا نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

> حضرت مولانا (ریاض احمد صاحب) رحمۃ اللہ علیہ کے ہم لوگوں پر جتنے احسانات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی کرم فرمائی ہے کہ اس سال (۱۹۲۶ء) کے اخیر میں یا ابتداء ۱۹۲۷ء میں حضرت مولانا نے مجھے اور میرے رفیق قدیم مولانا سیّد محمد شافق رحمۃ اللہ علیہ کو آستانہ عالیہ ''اندروا عباداللہ'' لے جا کر حضرت میاں قدس سرہٗ سے بیعت کرادی۔ (مکاتیب ریاضیہ، ص: ۱۹)

طالب علمی کی اس بیعت کا کیا اثر ہوا؟ بات یہ ہے کہ کچے پکے مطالعہ اور بعض

مرتبہ منطق وفلسفہ کے اشتغال سے طالب علم کی طبیعت میں دینی مسلمات وعقائد کے باب میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھ جاتے ہیں، جن کا نکالنا ایک کارِاہم ہوتا ہے، اس وقت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب بھی اس طرح کے حالات سے دوچار تھے، غالبًا حضرت مولانا ریاض احمد صاحب پر ان کی یہ ان کی یہ حالت مکشوف ہوئی، تو انھوں نے ازراہ کرم خود ہی ان کو لے جاکر اپنے پیرومرشد کے قدموں میں ڈال دیا۔ مولانا لکھتے ہیں:

> منطق وفلسفہ کی فضول موشگافی کے زہر فاسد نے میرے خیالات اور اسلامی مسلمات میں شکوک وشبہات کے شیطان کے وساوس وفاسد خیالات کی آویزش کھڑی کردی تھی، اللہ ارحم الراحمین! تیری قدرت! اور تیری قدرت کا کرشمہ! میاں رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک سے جیسے ہی ہاتھ بیعت کے لئے ملایا، ایک خاص کیفیت سی معلوم ہوئی، اور وہ تمام خیالات فاسدہ ہباءً منثوراً ہوگئے، اے ارحم الراحمین! تیرا ہزار شکر! وہ شکوک پھر نہ آئے، **فالحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات**۔
>
> یہ بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نوازش تھی کہ اس ورطہ سے نکالا، اے اللہ! اس کا اجر آپ ہی ان کو عطا فرمائیں، اور مجھ کو ہدایت پر قائم رکھیں۔ (مکاتیب ریاضیہ، ص:۱۹)

حضرت مولانا، میاں صاحب سے بیعت تو ہوگئے تھے، اور باطنی طور سے بہت کچھ فوائد سے بہرہ مند بھی ہوگئے تھے، مگر ابھی طالب علمی کا زمانہ پورا نہیں ہوا تھا، اس وقت کتابوں کی مصروفیت زیادہ تھی، اور اس بیعت کے ڈیڑھ پونے دوسال کے بعد حضرت میاں صاحب کا وصال ہوگیا تھا، اس لئے سلوک وطریقت میں زیادہ استفادہ کی نوبت نہیں آئی تھی۔

حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کی خدمت میں:

حضرت میاں ساحب کے وصال کے بعد کسی اور ''آستانہ'' کی جستجو ہوئی، جہاں حاضری دی جائے اور رُوحانیت کو عروج حاصل ہو، مولانا کے استاذ مکرم حضرت مولانا ریاض

احمد صاحب باوجودیکہ ایک کامل ومکمل شیخ تھے، مگر اللہ والوں کا رنگ کچھ عجیب ہی ہوتا ہے، یہ جتنا بلند ہوتے ہیں انھیں اپنی پستی اور ناکارگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے، غالباً عبدیت کا یہی نرالا انداز ہے کہ اس کی پستی ہی میں تمامتر بلندی کا راز ہے، حضرت میاں صاحب علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد انھیں بھی یہ احساس شدت سے ہوا کہ جبین دل کسی اور ''آستان کامل'' پر جھکانی چاہئے، اس وقت بہار میں ایک باکمال صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کا شہرہ تھا، حضرت مولانا بشارت کریم صاحب ضلع مظفر پور کے ایک گاؤں بازید پور گڑھول کے رہنے والے تھے، حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا روحانی تعلق جس سلسلے سے تھا، حضرت مولانا گڑھولوی کا بھی تعلق چند واسطوں کے بعد اسی سلسلے سے تھا، حضرت میاں شاہ نعمت اللہ صاحب اور حضرت مولانا بشارت کریم صاحب دونوں کا روحانی سلسلہ حضرت مظہر جان جاناں پر جا کر متحد ہو جاتا ہے، تفصیل یہ ہے:

حضرت خواجہ مظہر جان جاناں	م: ۱۱۹۵ھ
حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچی	م: ۱۲۱۸ھ
حضرت شاہ مراد اللہ صاحب تھانیسری	م: ۱۲۴۰ھ
حضرت مولانا ابوالحسن صاحب نصیر آبادی	م: ۱۲۷۲ھ
حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی	م: ۱۳۱۷ھ
حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب نوتنی	م: ۱۳۴۸ھ

حضرت خواجہ مظہر جان جاناں	م: ۱۱۹۵ھ
حضرت خواجہ شاہ غلام علی صاحب	م: ۱۲۴۰ھ
حضرت خواجہ شاہ ابو سعید صاحب	م: ۱۲۵۰ھ
حضرت خواجہ شاہ احمد سعید صاحب	م: ۱۲۷۷ھ
حضرت خواجہ دوست محمد صاحب قندہاری	م: ۱۲۸۴ھ
حضرت خواجہ محمد عثمان صاحب دامانی	م: ۱۳۱۴ھ
حضرت خواجہ سراج الدین صاحب	م: ۱۳۳۳ھ
حضرت مولانا شاہ غلام حسین کانپوری	م: ۱۳۴۱ھ
حضرت مولانا بشارت کریم صاحب	۱۳۵۴ھ

☆☆☆☆☆☆☆

سلسلہ کی مناسبت، وطن کی قربت اور حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کی نسبت، باطنی کمال، ان مجموعی خصوصیات وترجیحات کی بنا پر حضرت مولانا ریاض احمد صاحب گڑھول

کے آستانہ پر حاضر ہوئے، اور حضرت گڑھولوی کی وفات تک اکتسابِ فیض کرتے رہے، اندازہ یہ ہے کہ استاذ ہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب بھی اسی آستانہ شریفہ پر حاضر ہوئے، اور ان سے باقاعدہ بیعت ہوگئے، پھر ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے، رمضان شریف تو پابندی کے ساتھ شیخ کی خدمت میں گزارتے رہے۔

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''رمضان عام طور سے حضرت مولانا کے وطن گڑھول میں گزارا کرتے تھے، اور کافی دنوں تک تاحیات مولانا ان سے وابستہ رہے۔''

حضرت امیر شریعت کے داماد مولانا وصی احمد صاحب خبر دیتے ہیں کہ:

> ''ایک موقع ایسا بھی آیا کہ حضرت مولانا بشارت کریم صاحب نے امیر شریعت کو رخصت کرتے وقت فرمایا ''جاؤ پورا ہوگیا'' اس جملہ کی تاویل حضرت امیر شریعت اس طرح فرماتے تھے کہ حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کی عمر پوری ہو چلی تھی، اپنی عمر کے بارے میں یہ فرمایا تھا، چنانچہ اس ملاقات کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد مولانا کا انتقال ہوگیا۔''

حضرت مولانا بشارت کریم صاحب قدس سرہٗ کی وفات کے بعد کچھ دنوں ان کے مشہور خلیفہ شاہ نور اللہ صاحب (عرف پنڈت جی) کی خدمت میں حاضر ہوئے، یہ ایک نومسلم بزرگ تھے، حضرت مولانا بشارت کریم صاحب قدس سرہٗ کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے اسلام لانے سے پہلے ہی بہت کچھ ریاضت ومجاہدہ کر چکے تھے، حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کی ان کے بارے میں شہادت یہ ہے کہ:

> ''نور اللہ جب شروع شروع میں آئے تو ان کے قلب کی مثال ایسی تھی جیسے شیشہ کا نیا اور صاف لیمپ ہو، جس میں سفید اور صاف تیل بھرا ہوا ہو، اور بالکل نئی اور صاف سفید بتی لگی ہوئی ہو، بس میں نے اتنا کیا کہ اس میں دیا سلائی لگا دی۔ (الاکلیل، ص:۱۵۲)

یہ بزرگ مسلمان ہونے کے بعد عرفاً پنڈت جی ہی کہلاتے رہے، شیخ سے انھیں عشق ووارفتگی کا تعلق تھا، ان کے بعد انھیں بڑی بے قراری رہتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے، ۱۹۵۸ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کی خدمت میں:

حضرت مولانا ریاض احمد صاحب تو آپ کے خاص استاذ ہی تھے، انھیں کے حکم سے وہ حضرت میاں صاحب سے بیعت ہوئے تھے، پھر غالباً انھیں کے اشارے پر حضرت مولانا بشارت کریم صاحب اور حضرت پنڈت جی سے وابستہ ہوئے، پھر سلوک وطریقت کے مراحل باقاعدہ طور پر استاذ محترم ہی کی خدمت میں طے کئے اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب نے خلافت دے کر باقاعدہ اعلان فرمایا کہ ''میرے بعد مولانا عبدالرحمٰن صاحب لوگوں کو بیعت فرمائیں گے'' اور اپنے مریدوں کو نصیحت فرمائی کہ آپ لوگ ان سے وابستگی رکھیں گے۔ (بروایت مفتی ظفیر الدین صاحب)

۱۹۶۱ء میں حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کا وصال ہوا، اس کے بعد طالبان راہ طریقت آپ کے دامن فیض سے بکثرت وابستہ ہونے لگے، چنانچہ چھپرہ، چمپارن، گوپال گنج، سیوان اور دربھنگہ کے مسلمانوں نے آپ کو مرشد بنایا، پٹنہ کے بھی بہت سارے آفیسران اور جج صاحبان آپ سے بیعت ہوئے۔

حضرت امیر شریعت کے معمولات وخصوصیات:

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ ابتداء ہی سے صوفی منش، نرم گو، کم سخن اور خلوت پسند تھے، بلاشبہ آپ سلف صالحین کی ایک یادگار تھے، مجسم زُہد وایثار، سراپا تقدس، بے حد سادگی پسند، صاحب نسبت اور صاحب علم ومعرفت تھے۔ آپ ہمیشہ باوضو رہتے، وضو کرنے کے لئے مسواک ہمیشہ استعمال کرتے، جب دانت نہ رہے جب بھی

مسواک کو مسوڑھوں پر پھیر لیا کرتے تھے تا کہ سنت ادا ہوتی رہے، سنن و مستحبات اور آداب شرع کی پوری رعایت فرماتے، ننگے سر کبھی نہ رہتے بالخصوص کھانا کھاتے وقت کبھی ننگے سر نہ ہوتے، اور نہ کبھی ننگے سر استنجا کے لئے جاتے، نماز باجماعت کے نہایت پابند تھے، تکبیر اولیٰ کا بڑا اہتمام تھا، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب نے طالب علمی کا زمانہ کم از کم آٹھ سال ان کے ساتھ گزارا ہے، وہ شہادت دیتے ہیں کہ:

> ”مولانا نماز باجماعت کے بہت پابند تھے، اس عرصہ میں مولانا کی جماعت چھوٹتے نہیں دیکھا۔“

بزرگوں کے طریقے پر صبح صادق سے بہت پہلے اٹھ جانا آپ کا معمول تھا، رات کے آخری حصہ میں بیدار ہوتے اور خاموشی سے رات کی نماز نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرتے، اللہ والوں کا یہی وقت سب سے اہم ہوتا ہے، جب ساری کائنات خواب شیریں کی آغوش میں بے خبر ہوتی ہے، تو یہ اللہ والے اس وقت ہشیار ہوتے ہیں، پروردگار کا نزول اِجلال آسمان دنیا پر ہوتا ہے، تو یہ خدا رسیدہ بندے بیدار ہوکر مولیٰ کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں، ادب سے خشوع وخضوع سے اللہ کا کلام پڑھتے ہیں، ان کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں، آہ وزاریاں کرتے ہیں، عجز ونیاز کا تحفہ پیش کرتے ہیں، مولانا وصی احمد صاحب خبر دیتے ہیں کہ:

> ”تہجد کی ادائیگی اور قرآن کی تلاوت کبھی آپ سے فوت نہیں ہوئی۔“

فجر کی نماز کے بعد مشائخ کے دستور کے مطابق اشراق تک مصلیٰ پر بیٹھے وظیفہ پڑھتے رہتے، اشراق پڑھ کر مسجد سے باہر آتے، نمازوں کی امامت آپ خود فرماتے، اخیر عمر میں بہت کمزور ہوگئے تھے تو دوسروں کو امام بناتے تھے۔

حضرت مولانا کو کتابوں کے مطالعہ کا بھی بڑا ذوق تھا، علم بہت مستحضر تھا، جب کوئی مسئلہ پیش آتا اور مولانا اس کی گھتیاں سلجھاتے، تب سننے والوں کو اندازہ ہوتا کہ کتابوں پر

کس قدر عبور حاصل ہے، ورنہ عام طور سے آپ خاموش رہا کرتے تھے اور خاموشی کی وجہ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس دریائے علم میں کتنے بیش قیمت موتی تہ نشین ہیں۔

طلبہ پر شفقت : حضرت مولانا فراغت کے بعد مسلسل طالب علموں ہی کے درمیان رہے، انھیں پڑھایا، انھیں بہترین تربیت سے نوازا۔ طالب علموں پر آپ کی شفقت بہت بڑھی ہوئی تھی، کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو اس کی خبر گیری کرتے، ڈاکٹروں کے یہاں بھیجتے، دوا علاج کا انتظام کرتے، ضرورت ہوتی تو اسپتال بھجواتے اور اپنے اثر ورسوخ سے اہتمام کے ساتھ علاج کرواتے، ہلکی پھلکی بیماری ہوتی تو خود ہی بایوکیمک دوائیں عطا فرماتے۔ حکیم ڈاکٹر پرہیزی کھانے کے لئے کہتے تو اس کا انتظام کرواتے، گھر جانے یا گھر آنے کا کرایہ طلبہ کے پاس نہ ہوتا تو اس کا نظم کرتے، لیکن اس نرمی وشفقت کے ساتھ ان کی تربیت کا بھی خاص اہتمام کرتے، لیکن اس تربیت میں زجر توبیخ اور ڈانٹ پھٹکار نہ ہوتی، بلکہ نرمی کا پہلو نمایاں اور غالب رہتا۔

جماعت کی نماز کی طلبہ کو بہت تاکید تھی، معلوم کرتے رہتے تھے کہ کون آیا، کون نہیں آیا، جو نہ آیا اس سے بلا کر وجہ دریافت کرتے، اگر معقول عذر بیان کرتا تو نرمی برتتے ورنہ تاکید کرتے، اور غفلت سے باز آنے کا حکم دیتے، طلبہ اگر غلطی کرتے تو بڑی محبت سے مواخذہ کرتے، اس غلطی سے توبہ کرواتے، آئندہ کے لئے تاکید کرتے کہ اب غلطی نہ ہو، غرض سختی کا پہلو حضرت مولانا کے یہاں نہ تھا، اس سے طلبہ کے دلوں میں بڑی محبت پیدا ہوتی، اور بآسانی اصلاح ہوجاتی، پھر خود حضرت کے صاحب نسبت ہونے کا گہرا اثر ہوتا۔

صلۂ رحمی : رشتہ داروں قرابتداروں بالخصوص اپنے گھر کے افراد کے ساتھ حسن سلوک، اعلیٰ مکارم اخلاق میں ہے، قرآن وحدیث مین رشتوں کو برقرار رکھنے، رشتہ مندوں کے ساتھ حسن سلوک کی بہت تاکید آئی ہے، جو بندہ اللہ تعالیٰ کا جتنا فرمانبردار اور متقی ہوگا، اور جناب نبی کریم ﷺ کی سنتوں کا پابند اور آپ سے قریب ہوگا، وہ اتنا ہی رشتہ

داروں کے ساتھ حسن سلوک میں پیش پیش ہوگا۔ مولانا کی زندگی اس صفت خاصہ کی ایک دل آویز مرقع تھی، حضرت مولانا کے خاص عزیز جو بھانجے بھی ہیں اور داماد بھی، یعنی مولانا وصی احمد صاحب شمسی لکھتے ہیں کہ:

> ”گھر کے افراد، رشتہ داروں کا بہت خیال رکھتے تھے، بڑی محبت سے پیش آتے، ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے، ان سے بے تکلف باتیں کرتے، گھر خاندان کا احوال پوچھتے، جب بھی مجھے حضرت کے گھر پورہ جانا ہوتا تو باوجودیکہ میری خوش دامن صاحبہ یعنی حضرت کی اہلیہ خود بہت اہتمام کرتی تھیں، مگر حضرت بطور خاص خوش ہوکر ان سے فرماتے، عائشہ کی امی! وصی آئے ہیں، ان کے لئے گوشت، مرغ پلاؤ کا انتظام ہونا چاہئے، راحت وآرام کے تمام انتظامات پوچھتے رہتے۔ میرے بڑے بھائی علی احمد صاحب پٹنہ میں رہا کرتے تھے، آپ دفتر امارت شرعیہ تشریف لے جاتے تو بھائی کی رہائش گاہ پر ضرور تشریف لے جاتے، اور بھابھی کو دو روپے ضرور دیتے، علی احمد حضرت مولانا کے بھانجے ہیں، ان کے فرزند عبدالباری صدیقی جو بروقت ریاست بہار میں وزیر ہیں، یہ چھوٹے تھے، حضرت ان کو بھی دو روپئے دیتے اور فرماتے کہ ہمارے استاذ مولانا ریاض احمد صاحب بھی مجھ کو دو روپئے دیتے تھے، اساتذہ کی پیروی کرتا ہوں۔
>
> جب حضرت مولانا امیر شریعت ہوئے اور عبدالباری صدیقی سلّمہٗ کابینہ کے درجہ کے وزیر ہوئے تب بھی حضرت ملاقات کرنے ان کی سرکاری رہائش گاہ پر جاتے، اس وقت بھی والدہ عبدالباری کو دو روپئے دیتے، ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ پہلے تو عبدالباری اور ان کے والدین معمولی کرائے کے مکان میں رہتے تھے، اور اب سرکاری کوٹھی میں رہتے ہیں، اور آپ بھی امیر شریعت ہوگئے ہیں، تب بھی دو ہی روپئے عنایت کرتے ہیں، مسکراتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مولانا (ریاض احمد صاحب) مجھ کو بھی دو ہی روپئے دیا کرتے تھے، وہ روپیہ اب بھی تبرکاً رکھے ہوئے ہوں۔
>
> واقعی اس دو روپئے میں کیا برکت تھی، جس جس کو دیا، سب خوش حال ہیں خوش نصیبی

> سے مجھے بھی دوروپئے ملے ہیں، بفضلہٖ تعالیٰ خوشحال ہوں، عافیت سے ہوں۔
>
> یوں تو اپنی صاحبزادیوں کو اوران کی اولادوں کو اخیر عمر میں آپ نے زیادہ زیادہ رقمیں بھی دی ہیں، مگر یہ ضرور فرماتے کہ ہمارے حضرت نے مجھے دوروپئے عنایت کئے تھے، تبرکاً انھیں رکھے ہوئے ہوں۔

اس معاملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کو اپنے رشتہ داروں سے کتنا تعلق تھا، اور یہ بات بھی خوب واضح ہوتی ہے کہ اپنے استاذ وشیخ سے کیسا گہرا اور والہانہ لگاؤ تھا، انھوں نے دوروپئے دئے تھے، تو عمر کے اخیر مرحلے تک اسے ممنونیت سے یاد کرتے تھے اور صرف یاد نہیں بلکہ عملاً اسے برتتے تھے، اور اس کی برکت یہ تھی کہ جہاں جہاں دوروپئے دئے خوشحالی اور خوش نصیبی اس کے جلو میں آئی، بزرگوں کے انداز بھی کیا خوب ہوتے ہیں۔

قلیل منک یکفینی ولکن　　قلیلک لایقال قلیل

آپ کا تھوڑا سا عطیہ بھی میرے لئے بہت کافی ہے، گو آپ کے قلیل کو قلیل نہیں کہا جاسکتا (وہ بہرحال بہت ہے)

اپنے اہل کے ساتھ حسن سلوک:

حدیث شریف میں وارد ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ **خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي** تم میں بہتر آدمی وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ بہتر معاملہ کرتا ہو، اور میں اپنے اہل خانہ کے لئے سب سے بہتر ہوں۔ اس حدیث کی روشنی میں حضرت مولانا کے اخلاق اور اہل خانہ کے ساتھ بہتر معاملہ کو دیکھا جاسکتا ہے، مولانا وصی احمد صاحب لکھتے ہیں:

> " پہلی بیوی (ہمشیرہ حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب، مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، کچھ عرصہ گذرنے کے بعد اہلیہ محترمہ نے خود فرمائش کی کہ دوسری شادی کرلیں، حضرت مولانا نے فرمایا اولاد کا عطا کرنا اللہ کی قدرت ہے، کیا ٹھکانہ دوسری شادی کرلیں اور اس سے بھی اولاد نہ ہو، جب تک پہلی بیوی زندہ

رہیں، اصرار کے باوجود شادی نہیں کی، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ہی حضرت نے دوسرا نکاح کیا، جس سے دو صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے سلامت باکرامت ہیں، بفضلہٖ تعالیٰ ہر طرح بعافیت ہیں۔

لڑکیوں کے لئے گھریلو تعلیم کا انتظام کیا، صاحبزادے ماشاء اللہ عالم دین ہیں اور مدرسہ حمیدیہ گودنا میں مدرس ہیں، ان کی ولادت مدرسہ ہی کے اندر رہائشی مکان میں ہوئی، اس وقت حضرت ابوداؤد شریف کا درس دے رہے تھے، لڑکا تولد ہونے کی خوشخبری ملی تو آپ نے ابوداؤد محمد سفیان کنیت سمیت نام رکھا۔

مہمان نوازی: اللہ تعالیٰ جن بزرگوں کو عامۃ الناس کے فائدے کے لئے منتخب فرماتے ہیں، ان کی محبوبیت دلوں میں ڈال دیتے ہیں، محبت سے لوگ مجبور ہوکر مشقتیں اٹھاکر، صعوبتیں برداشت کرکے ان حضرات کی خدمت میں پہونچتے ہیں، دور نزدیک سے لوگوں کا تانتا بندھ جاتا ہے، ان میں بہت سے لوگ دنیاوی غرض سے بھی آتے ہیں، اور بہت سے دینی مقصد کے لئے حاضر ہوتے ہیں، لیکن جو آتا ہے مہمان ہوتا ہے، مہمانوں کی خاطرداری، ان کی خدمت گزاری ایمان کا تقاضا ہے، **من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفه**، جوکوئی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

حضرت چونکہ مدرسہ میں تھے، اس لئے اگر مریدین ومتوسلین آتے تھے تو طلبہ کے سرپرستوں اور متعلقین کی بھی آمدورفت رہا کرتی تھی، آپ سب کا بہت خیال رکھتے تھے، کھانے پینے سے لے کر چارپائی بستر تک سب کا اہتمام فرماتے کہ مہمانوں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو، مدرسہ چونکہ ریلوے لائن کے کنارے ہے اور اسٹیشن بھی قریب ہے، اس لئے بسااوقات بھولے بھٹکے اجنبی مسافر بھی آجاتے تھے، آپ ان کی مہمان نوازی بھی بشاشت سے کرتے، ضرورت مندوں کے ٹکٹ اور سفرخرچ کا بھی انتظام کردیتے۔

اَن دیکھے مہمان : مولانا وصی احمد صاحب بیان کرتے ہیں کہ ماسٹر سلطان احمد صاحب مدرس مدرسہ حمیدیہ گودنا نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت کو میں نے چائے کے لئے پوچھا تو حضرت نے مسکرا کر جواب دیا، ماسٹر صاحب ہم سے تو چائے کے لئے پوچھتے ہیں، اور ہمارے اتنے مہمان بیٹھے ہیں ان کو پوچھتے ہی نہیں کہ چوکی چارپائی یہاں تک کہ کھڑی پر بھی بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ کھڑے بھی ہیں، تب ماسٹر صاحب نے سمجھا اور کہا کہ حضرت والی بصارت کہاں سے لاؤں، آپ تو دیکھتے ہیں ہم نہیں دیکھتے، اچھا مہمانوں کے لئے بھی چائے لاتا ہوں۔

تقویٰ : اہل ایمان کا اصل سرمایہ تقویٰ ہے، دنیا وآخرت کی تمام بشارتوں کا مدار تقویٰ پر ہی ہے، تقویٰ کے درجات بہت ہیں، ایک شخص کفر وشرک سے بیزار ہو کر ایمان اختیار کرتا ہے، یہ بھی تقویٰ ہے، اور مشتبہات سے خود کو بچا کر اپنی زندگی بسر کرتا ہے، یہ بھی تقویٰ ہے، اور ان کے درمیان بے شمار درجات ہیں، جو شخص تقویٰ کے جس درجے پر فائز ہوتا ہے حق تعالیٰ کا اتنا ہی محبوب ہوتا ہے۔ حضرت مولانا ابتداء ہی میں اعلیٰ درجے کے اہل تقویٰ کی صحبت میں رہے تھے، اس لئے ان میں تقویٰ کا وہی رنگ رچ بس گیا تھا جو اہل اللہ کا خاصہ ہے، ہر قدم پھونک کر رکھتے، عبادت وریاضت کے خوگر تھے ہی، اوراد واذکار کے پابند بھی تھے، مکارم اخلاق اور معالی اوصاف کے ساتھ متصف تھے ہی، ان سب کے ساتھ ورع وتقویٰ کا وہ عالم تھا کہ مولانا وصی احمد صاحب خبر دیتے ہیں کہ:

> ’’حضرت مولانا کی خشک تنخواہ تھی، یعنی مدرسہ کی جانب سے مولانا کے طعام کا نظم نہ تھا، وہ انتظام بطور خود مولانا کے ذمے تھا، چاول اور سبزی وغیرہ بازار سے آتی ہے، اس وقت میں سودا سلف لانے کا ذمہ دار تھا، اور وہیں زیر تعلیم بھی تھا۔ یہ واقعہ ۶۳/۶۴ء کا ہے، ایک روز بازار سے سبزی وغیرہ لانے کے لئے پیسہ لینا بھول گیا، بازار آیا تو ماسٹر عطاء اللہ صاحب نے چرم قربانی کی رقم کی تھیلی میرے حوالے کی کہ چندہ کا روپیہ ہے، حضرت کو دیدینا میں نے اسی روپئے سے سودا سلف خرید لیا اور

> آ کر واقعہ کا تذکرہ کیا، اس پر حضرت خفا ہوئے، میں نے عرض کیا روپئے کے ردو بدل سے کیا ہوتا ہے، آپ مجھے پانچ روپئے دیدیں وہی روپئے میں آپ کو واپس کردوں گا کہ ماسٹر عطاء اللہ صاحب نے مدرسہ کو چندہ دیا ہے، آپ انھیں جمع کرلیں، مگر حضرت نے میری اس منطق کو تسلیم نہیں کیا اور آئندہ کیلئے تنبیہ فرمائی۔
>
> مولانا کے یہاں ہر مد کے الگ الگ ڈبے ہوا کرتے تھے، جس مد کا روپیہ ہوتا اسی مد میں رکھتے، مولانا کا دوسرا نکاح ہونے والا تھا، نکاح میں جانے والے جتنے مہمان متعین ہوئے تھے جاتے وقت ان میں ایک آدمی کا اضافہ ہوگیا، حضرت نے تو ان صاحب کو جو بغیر دعوت کے شریک ہوگئے تھے واپس نہیں کیا کہ ان کی سبکی ہوتی، لیکن اپنے چھوٹے بھائی مظفر حسین صاحب کو سمجھا بجھا کر واپس کردیا، مظفر صاحب نے کہا بھی کہ شادی بیاہ میں دو چار مہمان تو زائد ہو ہی جایا کرتے ہیں، حضرت نے فرمایا کہ مقررہ تعداد سے زیادہ لے جانا وعدہ خلافی ہے، جھوٹ ہوگا، اس لئے تم نہ جاؤ، یہ تھا حضرت کی احتیاط کا عالم!

عبادات کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ بارش ہو، کیچڑ ہو، اندھیرا ہو، لیکن مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرتے۔ مولانا وصی احمد صاحب سناتے ہیں کہ ایک روز میں ان کے یہاں مہمان ہوا، برسات کا موسم تھا، مولانا کے مکان اور مسجد کے درمیان راستہ تنگ تھا اور بارش کی وجہ سے کیچڑ بہت تھا، عشاء کے وقت حضرت مسجد جانے کے لئے تیار ہوئے، میں نے عرض کیا کیچڑ بہت ہے، اندھیرا بھی ہے، یہیں گھر میں جماعت سے عشاء پڑھ لیتے ہیں، حضرت نے فرمایا تمہارا جی چاہے تو گھر میں نماز پڑھ لو، میں مسجد سے نماز ادا کرکے آتا ہوں، یہ کہہ کر لاٹھی لی، ضعیفی کی حالت میں لاٹھی ٹیکتے ہوئے مسجد تشریف لے گئے اور باجماعت نماز ادا کی۔

کھانا بھوک سے کم کھاتے، لقمہ چھوٹا لیتے، خوب چبا کر کھاتے، کھانے کے ۱۵/۲۰ منٹ کے بعد ٹھہر ٹھہر کر پانی پیتے، ہر موقع کی دعاؤں کا اہتمام فرماتے، دوپہر میں قیلولہ کرتے، رات کا کھانا عشاء کے بعد کھاتے اور اس کے بعد کچھ دیر تک چہل قدمی کرتے۔

بہت ہی کم سخن تھے، مجلس میں عموماً خاموش، مراقبہ کی حالت میں بیٹھتے، جلسوں میں تقریر کرنے سے بچتے، اصرار ہوتا تو مختصر اور جامع تقریر فرماتے، مجلس میں کوئی کچھ پوچھتا تو نپے تلے الفاظ میں جواب دیتے، مقفیٰ اور مسجع عبارتیں بھی کبھی بے تکلف بولتے، مگر بہر حال مختصر! کبھی کبھی پوری مجلس ختم ہوجاتی اور آپ خاموش ہی رہتے، رعب اتنا تھا کہ کسی کو گفتگو میں پہل کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

ورزش اور پیدل چلنا: صبح وشام حضرت کئی کلومیٹر پیدل تفریح کرتے، اس دوران تسبیح پڑھتے رہتے، طلبہ کو بھی ورزش کی ترغیب دیتے، مدرسہ میں کشتی کے لئے اکھاڑہ بنا ہوا تھا، وہاں طلبہ ورزش کرتے اور کشتی لڑتے، حضرت فرماتے کہ بانی مدرسہ شیخ عبدالحمید کے زمانے میں ورزش کرنے والے لڑکوں کے لئے دودھ اور چنے کا انتظام رہتا تھا، اپنے بارے میں فرماتے کہ میں گھوڑسواری، سائیکل چلانا، بنوٹ کا فن، اور غلیل چلانا جانتا ہوں، فرماتے تھے کہ غلیل سے سوئی کو اڑا سکتا ہوں۔

امتیازی خصوصیات: حضرت مولانا ایک صاحب علم تھے، صاحب نسبت بزرگ تھے، بکثرت مریدوں کے شیخ تھے، بہترین استاذ تھے، صاحب رائے تھے، بہت لمبے عرصے تک نائب امیر شریعت رہے، پھر سات سال تک امیر شریعت رہے، سماجی وسیاسی سرگرمیاں بھی آپ کی ذات کے ساتھ وابستہ رہیں، یہ ساری خوبیاں وہ ہیں کہ آدمی مشہور اور نمایاں ہوکر رہے، لیکن اس جگہ مولانا کی بے نفسی دیکھئے کہ کہیں اپنے کو نمایاں نہیں کیا، ان کی زندگی کیا تھی؟ گمنامی، خاموشی، سادگی، خاکساری، بے نفسی اور عاجزی، ہر جگہ وہ اپنے آپ کو گمنام رکھتے، تحریر وتقریر، اخبار اور شہرت سے بچتے اور اس میں کامیاب ہوتے، یہ خصوصیت پورے سلسلۂ چاندشاہیہ کی ہے۔ اللہ اکبر! کیسے کیسے صاحب نسبت قدآور بزرگ اس سلسلے میں ہوئے، مگر سب نے گمنامی کی چادر میں خود کو لپیٹا، اسی سنت پر مولانا بھی چلتے رہے۔

امیر شریعت ہونے کے بعد بھی آپ عام آدمی کی طرح رہتے، امیر شریعت کا کمرہ

سب کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا، ہر شخص بے تکلف آپ کے پاس آتا، اور اپنی بات عرض کرتا، دعا کی درخواست کرتا، امارت کے ترجمان ''نقیب'' کے ہر شمارہ میں سابق امیر شریعت کا تذکرہ شائع ہوتا، مگر موجوہ امیر شریعت اس کے صفحات پر کم ہی آتے۔

نائب امیر شریعت : مولانا کو جمعیۃ علماء ہند اور امارت شرعیہ سے اس کے ابتدائی دور سے وابستگی تھی، بانیٔ امارت شرعیہ ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب سے خاص تعلق تھا، امارت کی تنظیم میں آپ کی خاموش کارکردگی بہت تھی اور بہت ٹھوس تھی، آپ سے پہلے چار امیر شریعت ہوئے، چاروں کے جلسۂ انتخاب میں آپ شریک رہے، اور نائب ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے نائب امیر شریعت حضرت مولانا محمد سجاد صاحب تھے۔ دوسرے نائب حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی ہوئے، ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء میں آپ کو نائب امیر شریعت نامزد فرمایا۔ حضرت مولانا منت اللہ صاحب آپ کے زہد وتقویٰ اور اخلاص واخلاق کے بہت معترف تھے، ایک مرتبہ خود پیش کش کر کے حضرت مولانا کے گاؤں پورہ تشریف لے گئے اور قدرے قیام فرمایا۔

امیر شریعت خامس : امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ صاحب کا وصال ۲؍ رمضان ۱۴۱۱ھ (۱۹؍ مارچ ۱۹۹۱ء) کو ہوا، ان کے انتقال کے بعد انتخاب امیر میں کچھ اختلافی صورت پیدا ہونے کا ندیشہ تھا، لیکن حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی ذات بابرکات موجود تھی، سب ارباب حل وعقدان کی امارت پر متفق ہوگئے۔ ۱۴؍ رمضان ۱۴۱۱ھ (۳۱؍ مارچ ۱۹۹۱ء) کو باتفاق رائے آپ امیر شریعت منتخب ہوئے، آپ کا دور امارت گو کہ قلیل رہا، مگر اس دور میں امارت نے اپنے رفاہی اور تعلیمی میدان میں بہت ترقی کی، آپ ہی کے عہد امارت میں مولانا سجاد اسپتال، مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء اور وفاق المدارس

الاسلامیہ بہار کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت مولانا اپنے رفقاء پر پورا اعتماد کرتے تھے اور انھیں کھل کر کام کرنے کا موقع دیتے تھے۔

علالت اور وفات: حضرت کی عمر ۹۵/سال ہوچکی تھی، شدید بڑھاپے کا ضعف تھا۔ ۲/ستمبر ۱۹۹۸ء کو آپ پر غشی کے دورے شروع ہوئے، اکثر بے ہوشی رہتی، کبھی کبھی ہوش آتا تو سر کی جانب اشارہ کرتے کہ ٹوپی پہناؤ اور تحریمہ باندھ کر نماز پڑھنے لگتے، پھر فوراً غشی طاری ہوجاتی۔ ایک روز موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سیّد نظام الدین صاحب عیادت کے لئے آئے، پکار کر اطلاع دی گئی تو بیٹھانے کا اشارہ کیا، پھر بار بار نیت باندھتے اور بے ہوش ہوجاتے، زندگی بھر نماز کا اہتمام کیا تھا، تو اس بے ہوشی کے عالم میں اگر کوئی چیز یاد آتی تو وہ نماز تھی۔ ۲۶/۲۵/دن یہی کیفیت رہی، آپ حی کلینک پٹنہ میں زیر علاج تھے۔

۲۹/ستمبر کو بظاہر طبیعت اچھی معلوم ہوئی، چہرے پر نئی تازگی ظاہر ہوئی، لوگوں کو امید ہوچلی کہ حضرت اب اچھے ہوچلے ہیں، پاؤں میں ورم آگیا تھا، وہ کم ہوگیا، عصر کے وقت اشارے سے پنکھا جھلنے کو کہا اور فرمایا کہ ڈاکٹر کو بلاؤ، داکٹر آئے، بلڈ پریشر دیکھا۔ مولانا وصی احمد صاحب نے سورہ یٰسین پڑھ کر دم کیا، بظاہر ایسی حالت ہوگئی جیسے آرام ہوگیا ہو اور نیند آگئی ہو، تیماردار مطمئن ہوکر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر بعد امارت شرعیہ کے ذمہ دار عیادت کو آئے، انھوں نے نبض دیکھی، کس نے ناک پر، کسی نے سینہ پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ حضرت تو جاچکے ہیں۔ إنا اللہ وإنا إلیہ رجعون، پھر ڈاکٹر نے دیکھا، انھوں نے بھی وفات کی تصدیق کردی۔ یہ مردحق آگاہ جیسا زندگی بھر خاموش رہا، خاموشی سے ۲۹/اکتوبر ۱۹۹۸ء بروز منگل بوقت ساڑھے سات بجے شام دنیا کو چھوڑ کر وہاں چل دیا جہاں کے لئے زندگی بھر تیاری کی تھی۔ رحمہ اللہ رحمةً واسعةً

حضرت کے جسد خاکی کو دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف لاکر امیر شریعت کے

کمرے میں رکھا گیا، قرآن کی تلاوت کا سلسلہ جاری ہوا، باہمی مشورہ سے یہ بات طے ہوئی کہ ۱۱؍ بجے دن میں پھلواری شریف میں نماز جنازہ ادا کی جائے، اور ۳؍ بجے شام کو مدرسہ حمیدیہ گودنا میں دوسری بار نماز ادا کی جائے۔

پھلواری شریف میں ۱۱؍ بجے حضرت مولانا سیّد نظام الدین صاحب کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اس کے بعد گاڑیوں کے ایک جلوس کے ساتھ حضرت کو لے کر لوگ گودنا روانہ ہوئے، حکومت نے اس جلوس کے ساتھ پولیس کی ایک فورس متعین کردی جو آگے آگے راستہ صاف کرتی جاتی تھی۔ درگا پوجا کا موقع تھا اس ئے سڑکوں پر جگہ جگہ ہجوم تھا، فورس کی وجہ سے گاڑیوں کا یہ جلوس کہیں رکا نہیں، شاہی جلوس کی شان سے ٹھیک ۳؍ بجے یہ قافلہ گودنا مدرسہ حمیدیہ میں پہونچا، جہاں ہزاروں افراد کا مجمع تھا۔ یہاں دوسری مرتبہ نماز جنازہ حضرت مولانا مظہر صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ سراج العلوم سیوان کی امامت میں ادا کی گئی۔

قبر شریف : حضرت نے اپنی زندگی میں ہی اپنے خاص لوگوں کو اپنے دفن ہونے کی جگہ بتادی تھی، مدرسہ حمیدیہ کی مسجد سے متصل جانب شمال میں ایک مختصر سا احاطہ ہے، اسی کی نشاندہی فرمائی تھی، فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے استاذ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ اس مسجد میں حضرت رسول کریم ﷺ اور سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لا چکے ہیں، اس لئے یہ جگہ انوار سے معمور ہے۔

وصیت کے مطابق اسی جگہ آپ دفن کئے گئے، زندگی میں بھی گوشۂ تنہائی پسند تھا، وفات کے بعد بھی ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں اکیلی آپ ہی کی قبر شریف ہے۔ **اللّٰھم اغفر له وارحمه وؤدخله فی رحمتک ونعمتک یاأرحم الراحمین۔**

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ رورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆☆☆☆☆